Mrs. Nausheen Raza

میری سرگذشت

از

سید مظہر حسین امروہوی

ناشر

شمیم بک ڈپو ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

تاریخ اشاعت جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

مطبوعہ

مسلم پرنٹنگ پریس کراچی

Mrs. Nasreen Raza

500

میری سرگذشت

از

سید ظفر حسن امروہوی

ناشر

شمیم بکڈپو ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

طبع شدہ جنوری ۱۹۷۰ء

مطبوعہ

(مسلم پرنٹنگ پریس کراچی)

کتبہ مجروح

میرا شجرۂ نسب

(بحوالہ تاریخ واسطی)

۱۔ محمد الرسول اللہ
۲۔ فاطمہ زہرا
۳۔ علی بن ابی طالب ع
۳۔ امام حسین ع
۴۔ امام علی ابن الحسین ع
۵۔ امام محمد باقر ع
۶۔ امام جعفر صادق ع
۷۔ امام موسیٰ کاظم ع
۸۔ امام علی رضا ع
۹۔ امام محمد تقی ع
۱۰۔ امام علی نقی ع
۱۱۔ سید جعفر ثانی
۱۲۔ سید ہارون
۱۳۔ سید علی
۱۴۔ سید حسین
۱۵۔ سید داؤد
۱۶۔ سید ابوالفرح واسطی

۱۷ سید ابوالمعالی
۱۸ سید مرتضیٰ
۱۹ میراں سید علی بزرگ
۲۰ سید حسین مخدوم
سید شرف الدین
۲۱ سید منیر علی
۲۲ سید تاج الدین
۲۳ سید یحییٰ
۲۴ سید بدر الدین
۲۵ سید وجیہ الدین قتال
۲۶ سید غازی خاں

۲۷ سید قطب الدین
۲۸ سید محمد محسن
۲۹ سید غلام محی الدین
۳۰ سید مبارک علی
۳۱ سید محمد علی
۳۲ سید حمایت علی
۳۳ سید امداد علی
۳۴ سید دلشاد علی
۳۵ سید ظفر حسن
۳۶ پسران سید ظفر حسن

سید تہذیب الحسن سید توصیف الحسن سید شمیم الحسن
سید نسیم الحسن سید ندیم الحسن سید قسیم الحسن ۔ سید شبیہ الحسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سزاوار حمد ہے وہ ذات جو مجھے کتم عدم سے منصۂ شہود پر لایا اور میری حیاتِ فانی کی بقا کے لئے وہ سامان مہیا کر دئے جن پر میری زندگی کا دار و مدار اور میری رُوحانی اور مادّی ترقی کا انحصار تھا۔ اس نے اپنے فضل و کرم سے بے شمار نعمتوں کی اتنی بارش کی کہ ان میں سے کسی ایک کے شکریہ سے عہدت العمر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ہر موئے بدن گرچہ زباں ہو میرا ۔۔۔ ممکن نہیں بندے سے ثنائے خالق

درود و سلام خدا کی ان برگزیدہ ہستیوں پر جو ہدایت خلق کے لئے بہ پیکر انسانی اس دنیا میں تشریف لائے اور نااہل بندوں کے ٹوٹے رشتے خدا سے ملائے۔

محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت میرا ایمان اور ان کی پیروی میری نجات کا سامان ہے ان کے دامنوں سے تمسک دین و دنیا دونوں کی فلاح کا ضامن ہے۔

خدائے بزرگ و برتر سے یہی دعا ہے کہ ان کا نام لے کر مروں اور ان کا کلمہ پڑھتے پڑھتے زبان بند ہو سے

ثنائے محمدؐ دمِ واپسیں ہو ۔۔۔ نکل جائے جاں یا علیؑ کہتے کہتے

مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات

اے خالق بے نیاز، اے معبود کارساز تیری بارگاہ عز و جلال میں تیرے اس عبدِ گنہگار کی یہ التجا ہے کہ میرے والدین کو جو عرصہ ہوا تیری سرکار میں حاضر ہو چکے ہیں اپنی رحمت کے سایہ میں رکھنا میں نے جو کچھ تیرے برگزیدہ دین کی خدمت کی ہے یہ ان ہی کی تربیت اور ان ہی کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ تو واقف ہے کہ وہ تیرے نیک بندے، چہاردہ معصومین کی شدید محبت رکھنے والے تھے۔ انہوں نے دانستہ تیرے حکم کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی انہوں نے اپنے دین کو دنیا کے ہاتھوں نہیں بیچا۔ تیری رحمت نکتہ نواز ہے ان کے گناہوں کو بخشدے ان کی خطاؤں سے درگزر کر۔

اے رحیم و رحمٰن اے جواد و کریم ذات میرے گناہوں اور بداعمالیوں پر نظر نہ کر بلکہ اپنی رحمتِ واسعہ کے تقاضے سے ان کو ائمہ طاہرین کے جوار میں جگہ دے۔

رحمتِ حق بہا نمی جوید   رحمتِ حق بہانہ مے جوید

تیری بارگاہ میں میری یہ دعا ہمیشہ رہے گی۔

انجام ہو بخیر مرے والدین کا
دیتا ہوں تجھ کو واسطہ خونِ حسین کا

پیش لفظ

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کا دستور قدیم الایام سے چلا آ رہا ہے۔ فن تاریخ کا ایک جزو یہ بھی ہے۔ اگر سیرت نگار کا قلم قرینے سے چل جائے اور وہ اپنے اسلوبِ بیان کے دامن میں ان تمام جواہر ریزوں کو سمیٹ لے جن سے صاحبِ سیرت کے ہر پہلوئے زیست پر روشنی پڑتی ہو تو بے شک اس کی عالمگیر افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

انسانی زندگی کی لپیٹ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر تمدنی، معاشرتی اخلاقی، مذہبی اور سیاسی واقعات کچھ اس طرح آ جاتے ہیں کہ صاحبِ تدبر انسان کے لئے تجربات کی ایک البم بن جاتی ہے اور اخذِ نتائج کے بعد بہت سے تاریک راستوں میں رہنمائی کے بلب روشن ہو جاتے ہیں اور یوں اسلاف کے کارنامے اخلاف کے لئے منارۂ ہدایت کا کام دینے لگتے ہیں۔

کسی کے سوانح حیات کو سطحی نظر سے پڑھنے والا بس اتنا ہی پاتا ہے جتنا سمندر کے کنارے بکھری ہوئی سیپیاں اور گھونگے جمع کرنے والا اپنا دامن بھر لے البتہ جن کی نظر عمیق ہوتی ہے وہ اس زندگی کے حدود میں اس زمانہ کی معاشرت، طرزِ ماند و بود، قلبی تاثرات، طبعی رجحانات، اخلاقی اقدار، تعلیمی جزر و مد اور اجتماعی اور انفرادی معاملات تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی زمانے کے واقعات کتنے ہی سطحی کیوں نہ ہوں ان میں پسِ پردہ ضرور کچھ سبق آموز تجربے وزدیدہ نگاہوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔

دنیا میں شاید ہی کوئی بدنصیب قوم ایسی ہوگی جس میں کچھ لوگ ایسے نہ پائے جاتے ہوں جن کی سیرت کے نقوش صفحہ قرطاس پر آکر لوگوں کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔

سیرت نگاری کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی اپنی سوانح عمری خود لکھے اس میں حقیقت نمائی کی چمک زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ صاحب سیرت کا بیٹا، کوئی شاگرد یا کوئی دوست یا عزیز لکھے جس سے اس کی زندگی زیادہ وابستہ رہی ہو اور اس کی زندگی کی ہر موڑ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو اس کے واقعات زندگی کی تدوین کرے۔ ایسی واقعہ نگاری میں ارادت و عقیدت کی گل افشانیاں اور مبالغہ آمیز زور آزمائیاں زیادہ ہوتی ہیں اور بسا اوقات "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" کے نقارے بھی بج جاتے ہیں اور انشا پردازی اپنی دلنواز محفل میں ایسی نوایات کو بھی لا کھڑا کرتی ہے جن کے چہروں پر درایت کی چمک نہیں ہوتی اور مصنوعی خد و خال ایک حقیقت پسند انسان کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگتے ہیں۔

اقوام عالم کے نامور دانشوروں، تنظیمی جماعتوں کے سربراہوں، لیڈروں ریفارمروں، اخلاقی اور سیاسی کارپردازوں، مذہبی پیشواؤں، شہرۂ آفاق صنعت کاروں اور نامور موجدوں کی کتنی سوانح عمریاں اس وقت موجود ہیں ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر زبان کی یہ دماغی کاوشیں یکجا کی جا سکیں تو غالباً دنیا کی ایک بہت بڑی لائبریری بھی جا سکے گی۔

سیرت نگاری کی اصلی غرض تو یہی ہوتی ہے کہ کسی غیر معمولی قابلیت کے انسان کو اس کے بنی نوع سے متعارف کرایا جائے اور اس کی زندگی کے اہم واقعات کو پیش کر کے تحسین کی جائے۔ رہی ثانوی اغراض ان میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔

انسان آغاز آفرینش ہی سے اپنے دائرہ عمل میں ایک نمونہ کا محتاج رہا ہے۔ یہ نمونہ اگر مجسم صورت میں نظر کے سامنے ہو تو دل کی سوتی دنیا ذرا جلد جاگ جاتی ہے اور ولولوں اور ارادوں کی مفلوج رگوں میں تقلید و تاسی کا گرم خون اس تیزی سے دوڑنے لگتا ہے کہ ایک جادو کا سا تماشہ نظر آتا ہے۔ بزدلوں کے دلوں میں شجاعت کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں بخیلوں کے سنسان و ویران میدانوں میں سخاوت کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جو جاہلوں کے ٹھنڈے دلوں کو علم کا شوق گرمانے لگتا ہے اور ناکارہ سست اور کاہل لوگ قوم کی فعال جماعت بن جاتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یعنی مکتوبی یا ملفوظی روح عمل کا بیان بھی موثر ہوتا ہے مگر لکھے لکھائے کتابوں کے پڑھنے والے اگر صاحب ادراک و شعور ہیں تو وہ واقعات کی تہیں الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں اور جب تہ میں کوئی کارآمد چیز نظر آتی ہے اسے دل و دماغ میں جگہ دے کر اپنی زندگی کی اندھیری تاریک چالوں میں اسے خضر راہ بنا کر ٹھوکریں کھانے سے اپنے کو بچا لیتے ہیں

سوانح عمریاں مختصر ہوں یا طولانی انسانی دل و دماغ کی رہنمائی کے لئے کم و بیش مواد ضرور اپنے دامن میں لئے ہوتی ہیں لیکن کوئی ان سے فیض پاتا ہے کوئی نہیں یہ پڑھنے والے کی اہلیت اور قابلیت پر منحصر ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

مجھے ابتدا سے سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق رہا ہے میں نے کبھی اس پر نظر نہیں کی کہ کس مذہب و ملت کے شخص سے تعلق رکھتی ہے۔ "متاع نیک بہر دکاں کہ باشد"۔ میں نے اپنا عزیز وقت صرف اس لئے صرف کیا کہ شاید سنگ ریزوں میں کوئی جواہر پارہ میرے مطلب کا بھی ہو۔ میں اپنے اس مقصد میں کچھ نہ کچھ کامیاب ضرور ہوا۔

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم — ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

وجہ نگارش

میری عمر اسّی سال کے قریب پہنچ چکی ہے۔ عمر کا آفتاب لبِ بام سے پنیچے اتر چکا ہے جو بے نور ہلکا سا کنارہ اُفقِ روزگار پر نظر آ رہا ہے، وہ عنقریب نظروں سے غائب ہوا چاہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شکستہ پا مسافر اپنی آخری منزل پر کب پہنچتا ہے اور بقیہ عمر کے حالات میرا ہی قلم لکھے گا یا کسی اور کی زحمت کا رہینِ منت ہوگا۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ... ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اب حال یہ ہے تو یہ ہے

جوانی کی توانیاں اور شباب کی ہنگامہ خیزیاں پیری کی لگد کوب میں آ چکیں جس باغ میں بہار تھی اب اس میں خزاں کا دور دورہ ہے جس گھر میں سب کچھ تھا اب اس میں خاک اڑ رہی ہو۔ دماغی صلاحیتیں ختم۔ حواس مختل۔ حافظہ مفلوج۔ جذبات مسلے ہوئے۔ شوق کے آتش فشاں پہاڑ برف سے زیادہ ٹھنڈے۔ عزائم کے سر بفلک ایوان زمیں بوس آرزوؤں کی چنگاریاں تہ خاکستر۔ احساسات سوکھے ہوئے دریا۔ تخیلات مدقوق۔ نہ دل میں جوش نہ دماغ میں طاقت نہ ہاتھ پاؤں میں کس بل۔ بصارت کی آنکھوں میں دھند سماعت کے کان بہرے۔ دانتوں کے پرے غائب دو چار ہیں تو ہلنے پر تیار

جو جا چکی وہ تاب و تواں ڈھونڈ رہا ہوں ... پیری میں جوانی کا نشاں ڈھونڈ رہا ہوں

حسرت بھری نگاہوں سے اس انقلابِ عظیم کو دیکھ رہا ہوں اب تو مجھے صرف اس وقت کا انتظار ہے جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا۔

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط ... اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

قلم یوں تو اب بھی ہاتھ میں ہے مگر وہ زور کہاں، وہ ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح گھسٹتا جاتا ہے۔ اب دل تو یہ چاہتا ہے کہ علائق کی بیڑیاں کاٹ کر زندگی کے باقی لمحات ایک پرسکون فضا میں گزار دوں مگر کچھ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ جو عرصہ سے اٹھائے چلا آرہا ہوں سر سے اتار پھینکنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کمزوری طبیعت کی ایک یہ بھی دلیل ہے۔

جوانی کے مشغلے میری پیری پر رحم نہیں کھاتے۔ برسوں کی عادت جو طبیعت ثانیہ بن چکی ہو مجھ ناتوان کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی وہی صبح وہی شام وہی قلم وہی کاغذ وہی فرائض وہی کاوش۔

میرے صاحبزادوں کی ستم ظریفی دیکھئے اس گئی گزری عمر میں جبکہ قلم انگلیوں میں ڈھیلا پڑ گیا ہے دماغی صلاحیتوں پہ اوس پڑ چکی ہے جب کہ زندگی خاتمہ پر آ لگی ہے مجھ سے سوانح عمری لکھنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ یہ فریضہ تو ان کا تھا کہ میرے مرنے کے بعد جو چاہتے لکھتے۔ کیسے غضب کی بات ہے اپنا بوجھ میرے اوپر ڈال رہے ہیں۔ انہیں کیا خبر میں عالم میں ہوں ؎

شب تاریک بیم جاں و گردابے چنیں حائل
چہ مے دانند حال ما سبکساران ساحلہا

یہ میں جانتا ہوں کہ یہ اس فطری محبت کا تقاضا ہے جو سعادتمند اولاد کو اپنے ماں باپ سے ہوتی ہے وہ مجھے مرنے کے بعد بھی زندہ دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ میں کیا اور میری سوانح عمری کیا۔

نہ صاحبان کمال کے کسی طبقہ میں شمار
نہ ارباب مناصب کی کسی محفل کا کارکن۔
نہ سیاحوں کے زمرہ میں شامل۔
نہ سیاستدانوں کی انجمن کا ممبر۔

نہ علمائے دین کی بزم قدس کا حاشیہ نشین۔

ایک بے بضاعت انسان ایک بے مایہ ہستی۔

عمر بھر قلم چلایا ضرور ہے رطب و یابس جمع کر کے ۱۰۰ کتابیں بھی لکھ دی ہیں۔ مگر یہ زندگی کے ایسے واقعات نہیں کہ پڑھنے والوں کے لئے کوئی کیف پیدا کریں۔

علاوہ بریں اتنی سال پہلے کے واقعات بھی پوری طرح حافظہ میں محفوظ نہیں اور جو کچھ ہے وہ اہل نظر کے سامنے رکھنے کے قابل نہیں بھلا ان سوکھے ٹکڑوں کو۔ جو نمک کے پانی میں چوئے ہوتے ہیں کون کھائے گا "شب در بازار جوہریاں بجوئے نیرزد" ارباب دانش مذاق اڑائیں گے کہ ایک معمولی سا آدمی اپنے بے کیف سوانح حیات لکھ کر دوسروں کے عزیز وقت پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔

بہر حال اپنے بچوں کی دل شکستگی کے احساس نے اس غرض کو پورا کرنے کے لئے قلم کو انگلیوں کی گرفت میں دے تو دیا ہے آگے کیا ہوگا اس کو اللہ بہتر جانتا ہے

میری اس تحریر کا مقصد اپنی برتری کا نہ اعلان ہے نہ تمنائے ستائش بلکہ صرف اتنی غرض ہے کہ میری اولاد اور اولاد کی اولاد میرے مرنے کے بعد یہ تحریر پڑھ کر مجھے یاد کر لیا کریں اور میری زندگی کے یہ چند مٹے مٹے نقوش بطور یادگار اپنے پاس رکھیں اور اگر توفیق الٰہی شامل حال ہو تو ایک سورۃ فاتحہ کا ثواب میری روح کو بخش دیا کریں۔

یہ واقعات میں ایک ایسے زمانہ میں سپرد قلم کر رہا ہوں جب کہ چار سال کی محنت شاقہ کے بعد اصول کافی جلد اول و دوم اور فروع کافی جلد اول کے حصہ اول کے ترجمے سے فارغ ہو کر زر کثیر صرف کر کے ان کو طبع کرا چکا ہوں۔

اور اب حصہ دویم کے ترتیب میں ہمہ تن مصروف۔ یہ کام جس قدر محنت طلب ہے اہل علم اس کا اندازہ کرسکتے ہیں اس اہم دینی خدمت نے میرے اوقات فرصت کو تنگ سے تنگ تر بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ میری اس تحریر میں کوئی خاص خوبی پیدا نہیں ہوئی۔ حاطب لیل کی طرح جو واقعہ یاد آیا ہے قلم برداشتہ لکھتا چلا گیا ہوں تاکہ جلد اس جھمیلے سے نجات ملے۔

میرا حسب و نسب

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

انا ابن نفسی وکنیتی ادبی — کنت من العجم او من العرب

ان الفتیٰ من یقول ها انا ذا — لیس الفتیٰ من یقول کان ابی

میں اپنے نفس کا بیٹا ہوں اور میری کنیت ادب ہے — چاہے میں عجمی ہوں یا عربی

جوان وہ ہے جو کہے میں یہ ہوں — نہ کہ وہ جوان جو کہے میرا باپ ایسا تھا

حسب و نسب پر فخر کرنا اور اس کو دستار فضیلت کا طرہ امتیاز بنانا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ مگر ہے دلچسپ۔ یورپ و ایشیا کے ارباب دانش اس مسئلہ میں مختلف نظریات رکھتے ہیں **اہل یورپ** جن کو فی زمانہ مہذب دنیا کا معمار اور اقلیم عقل و دانش کا شہنشاہ سمجھا جاتا ہے اس نقارہ فخر کی آواز کو اپنی سوسائٹیوں میں گونجنے ہی نہیں دیتے ان کو کاروبار کی مصروفیت اور ایجادات و اختراعات کی گھما گھمی میں اتنی فرصت کہاں کہ

کر نسابیوں بھانوں اور یاد خوانوں سے باپ دادا کا شجرۂ نسب سن کر فخر کی ٹوپیاں اچھالیں وہ تو سیلف میڈ SELF MADE لوگ ہیں ان کو **پدرم سلطان بود** کا ترانہ نا وقت کی راگنی معلوم ہوتا ہے۔

عیسائیوں کو شاید ان بوسیدہ ہڈیوں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنا اس لئے پسند نہیں کہ ان کے ہادی دین کا باپ ہی نہ تھا مادری نسب کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

یہودی۔ ان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ان کے نسب کا کیا پوچھنا وہ خدا کی اولاد اور رشتہ دار ہیں نحن ابناء اللہ واحباءہ (القرآن) یہ تو ان کی انتہائی توہین ہے کہ ابنائے آدم سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑیں ع ایں زمیں را آسمانے دیگر است۔ دعویٰ ابنیت یہ بلند بانگ دعاوی اور خدا کی معذب و مغضوب قوم۔ تان بھی ٹوٹی تو کہاں جا کر۔

یونانی۔ اس فخر کا دروازہ تو انہوں نے اپنے اوپر کھولا ہی نہیں انہوں نے اس سلسلہ کی داد دے اپنے استاد کی فضیلت سے جا ملائی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی اور بدن کی جزی معلوم ہوتے ہیں تلمذ نے ابنیت کا گلا گھونٹ کر سلسلۂ نسب یوں چلایا **فیثا غورثی**۔ **سقراطی، بقراطی، افلاطونی** (معارف یونان) باپ دادا تو طاق نسیاں کا گلدستہ بن گئے۔ اور استاد کی عظمت بزم نسب میں تھرکنے لگی۔

ہر شخص راست راہے دینے و قبلہ گاہے ۔ ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہے

ہندوؤں نے تو یہ ڈھول اتنی اونچی آواز سے بجایا اور ایک ایسا ترانہ الاپا کہ خدا کی نژادوں کا کیا ذکر آسمانی طبقے لرز گئے اور ساکنان ملاء اعلیٰ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ستاروں نے قہقہے لگائے۔ دعویٰ یہ ہوا کہ ہم چندر بنسی اور سورج بنسی ہیں اس نسب کو چار چاند یوں لگے اب کہ لوگ چاند تک پہنچ گئے چندر بنسی تو اپنے

ددھیال تک پہنچ ہی جائیں گے اور بوڑھے سے دادا سے جا ہی ملیں گے۔ سورج بنسیوں کا دیکھئے کیا بنے۔

قدیم مصر میں بھی کچھ دنوں یہ ڈنکا بج چکا ہے یعنی قبطی نسل اپنے کو بنی اسرائیل سے نسباً بہت اونچا سمجھتے رہے۔

عرب نسبی فخر و مباہات کی گھڑ دوڑ میں عرب کا گھوڑا سب سے آگے نظر آتا ہے۔ اس امر خاص میں انھوں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ ان کے انساب ہر سلسلے کے نام سو سو پشت تک یاد رکھتے تھے اور اخلاف اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرکے فخر کی ڈوبیا اچھالتے تھے یہ لے یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے سوا ہر ایک قوم کو بے نسلا جانتے تھے۔ ان کے نسبی شجرے ریشمی پارچوں پر سنہرے حرفوں میں لکھے جاتے تھے جو ہر گھر میں محفوظ رہتے تھے۔

لطیفہ:۔ صاحب قاموس کے متعلق سنا جاتا ہو کہ لغت عرب کا یہ سب سے بڑا عالم عجمی النسل تھا۔ عرب اس کا لوہا مان گئے تھے اور اس کو عربی النسل ہی سمجھتے تھے چنانچہ اس دھوکے میں ایک عربن سے اس کی شادی ہو گئی۔ شب زفاف جب حجلۂ عروسی میں دونو یکجا ہوئے تو صاحب قاموس نے اپنی دلہن سے کہا اقتلی السراج چونکہ عجمی تھا اپنی مادری زبان "چراغ کُش" کا ترجمہ عربی زبان میں کر بیٹھا عرب اس کی بجائے اُطفی السراج کہتے ہیں۔ عربن یہ سن کر چراغ پا ہو گئی۔ اس کو اس بدنامی پر بڑا غصہ آیا کہ اس کی شادی ایک مرد عجم سے کردی گئی ہے۔ غصے میں بھری ہوئی میکے پہنچی اور خوب رُلی بیٹھی۔ باپ تلوار لے کر داماد کے سر پر آکھڑا ہوا اور وہ لے دے مچی کہ خدا کی پناہ۔

عکاظ ایک مشہور میلہ لگے بازاروں میں اس مفاخرت کی گرم بازاری بہت زیادہ ہوئی نسب پر فخر ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا ہر قبیلہ کا نامور شاعر اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرکے پرانی ہڈیوں میں نیا فاسفورس بھرتا تھا۔ اس موضوع پر سرزمین عرب پر اس کثرت سے بارش ہوئی ہے کہ اس کی تری عربی لٹریچر میں آج تک موجود ہے۔

لطیفہ:۔ ہندہ نامی ایک عربن ایک عجمی سے زنا کرا بیٹھی اور حاملہ ہوگئی خاندان کو پتہ چلا تو اس کا پیٹ چاک کرکے بچہ نکال لیا تاکہ خاندان پر بدنسلی کا دھبہ نہ آئے۔

ایک مشہور شاعر کو بادشاہ نے بدنسلی کا طعنہ دیا شاعر کی شرافت اس چوٹ کو برداشت نہ کرسکی تیر و کمان لیکر بے محابا بادشاہ کے دربار میں جا پہنچا کمان کی نوک پیر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اپنی صحیح النسبی کے متعلق اس جوش میں قصیدہ پڑھا کہ کمان ہتھیلی توڑ کر نکل گئی اور اسے خبر نہ ہوئی۔ یہ محویت یا تو زبان مصری پر طاری ہوئی تھی یا اس شاعر پر۔

اسلام نے بھی شرافت نسبی کو فضیلت کی مسند پر بٹھایا ہے۔ سرکار دو عالم نے بھی اس پر فخر کیا ہے اور فرمایا کہ "خدا نے ہمارے نور کو اصلاب طاہرہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل کیا۔ یہ وہ سلسلۃ الذہب ہے جس کی کسی کڑی پر کفر و شرک کا ہلکا سا بھی زنگ نہیں لگا۔

اس میں شک نہیں کہ آباؤ اجداد کی حسبی و نسبی شرافت کو اولاد کے عادات وخصائل اور ان کے کردار کے بنانے یا بگاڑنے میں بہت بڑا دخل ہے آدمیوں کا کیا ذکر اچھی نسل کے گھوڑے جنگ میں کٹ مرتے ہیں مگر اپنی جگہ نہیں چھوڑتے

اور اپنے سوار کی حفاظت سے منہ نہیں موڑتے۔ اسی طرح اچھی نسل کے کتے مالک کی وفاداری میں جان دیدیتے ہیں۔

اگر نسلی پاکیزگی کو فضیلت میں کوئی دخل نہ ہوتا تو اللہ تعالےٰ اپنی بارگاہ کے مناصب جلیلہ کو اولاد انبیا کے لئے مخصوص نہ کرتا۔

لیکن اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ فضیلت نسبی کا منشا یہ نہیں کہ اپنے آباء و اجداد کے کارناموں ہی کو صرف اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھا جائے اور اپنی ذات میں کمال پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور "پدرم سلطان بود" کے کھوکھلے نعرے مار کر اپنے پندار کے مرے چوہے کو گوبر سنگھایا جاتا اور مُردوں کی ہڈیوں پر اپنے اعزاز کی مسند بچھائی جائے یہ تو اپنی حماقت پر تالیاں بجوانا ہے۔

اگر نسبی فضیلت کے ساتھ ذاتی کمالات کا پیوند بھی لگا دیا جائے تو اس سے انسانی وقار کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

نسب و حسب کے علاوہ کچھ وجوہ فضیلت اور بھی ہیں ورنہ اصلیت کے اعتبار سے تو سب انسان برابر ہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے اس غلط پندار کی شہ رگ پر یوں نشتر مارا ہے۔

الناس من جهة التمثال اكفاء — ابوهم آدم والام حواء

وان يكن لهم من اصلهم شرف — يفاخرون به فالطين والماء

یعنی صورت میں تو سب انسان برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم اور ماں حوا ہیں۔ اگر بلحاظ اصل ان کے لئے کوئی چیز باعث شرف ہے تو صرف یہی کہ وہ مٹی اور پانی سے بنے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے بے کمال انسان کو اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک گدھے پر ریشمی جھول ڈال دینا اور اگر حسبی اور نسبی شرافت کے ساتھ کمال نفس بھی ہو تو سونے پر سہاگہ۔

ہمارے وطن امروہہ میں آج تک یہ دستور ہے کہ نکاح کے بعد نسّاب یا مراثی دولہا دلہن دونوں کا نسب نامہ یوں سناتا ہے۔

چودہ ہزار سال پدرے پشت پناہ سوار رسول کے گلشن پھول مکے مدینے کے پیمبر گھر نواسے حضرت علی کے پوتے حضرت امام حسین کے پوتے حضرت امام زین العابدین کے پوتے یہاں تک کہ وہ امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے پھر کہتا ہے سید جعفر تواب ثانی کے پوتے اس کے بعد سلسلہ نسب کی کڑیاں ملاتا ہوا وہ مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت تک پہنچتا ہے۔ (یہ تمام سادات امروہہ کے جد اعلےٰ ہیں) اس کے بعد وہ نسبی کڑیاں جوڑتا دولہا دلہن کے باپ تک آتا ہے اور ان کا نام لے کر کہتا ہے فلاں حسینی کے سپوت جاتے۔ یہ نسب نامہ لڑکے اور لڑکی کا علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اول لڑکے کا بعد کو لڑکی کا۔

مجھے اس پر فخر ہے کہ میں دسویں امام حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد سے ہوں جن کا سلسلہ نسل جناب جعفر تواب سے چلتا ہوا ہم تک پہنچتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ نسبی میں کوئی کڑی زنگ آلود نہیں۔

میرا وطن

اسکاٹ نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ انسان کا کوئی خاص وطن نہیں جہاں وہ کچھ دنوں زندگی گذارتا ہو وہی اس کا وطن بن جاتا ہے اور اس کو اس جگہ سے محبت ہو جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ حبِ وطن فطرتِ انسانی کا ایک نہایت شریف جذبہ ہے اور ایمان کا ایک جز۔ حب الوطن من الایمان اس میں راز یہ ہے کہ جس سر زمین کی مٹی سے انسانی پیکر بنتا ہے اس کی محبت فطرتِ انسان کے رگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے کل شئی یرجع الیٰ اصلہٖ۔

انسان کا کیا ذکر حیوانات و نباتات تک میں اس جذبہ کا اثر پایا جاتا ہے حالی مرحوم نے فرمایا ہے۔

جا کے کابل میں آم کا پودا ۔۔۔ کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آکے کابل سے یہاں بہی وانار ۔۔۔ ہو نہیں سکتے بارور زنہار

بہت سے اسباب ہیں جو وطنی محبت انسانی رگ و ریشہ میں پیوست کر دیتے ہیں۔ مثلاً آب و ہوا کی موافقت۔ معاشرہ کی سازگاری۔ باہمی اختلاط و ارتباط۔ خاندانی اثرات۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں آسانی۔ املاک و جاگیر سے وابستگی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے دامن دل کو ہمیشہ اپنی طرف پوری قوت سے کھینچتی ہیں کیوں کہ راحت و آسائش کا بار زیادہ تر ایسے ذرائع ہی پر ہوتا ہے۔ اگر انقلاب روزگار سے انسان ترکِ وطن پر مجبور ہو جائے تو ان چیزوں سے انس و محبت کے تاروں کا یک لخت کھینچ لینا اتنا ہی اذیت رساں ہوتا ہے

جتنا بیان سے جان نکلتا۔ انسان اس سرزمین کو نہیں روتا وہاں کے در و دیوار کی یاد میں نہیں تڑپتا بلکہ اس کے دل پر رنج و غم کا سارا ہجوم ان تعلقات کی محرومی سے ہوتا ہے جو اسکے نخلِ حیات کے تر و تازہ ہوا تھے یا اس کے اسلاف کے کارناموں کے وہ مفید نتائج تھے جن سے اس کی زندگی پھولوں میں کھیلتی تھی یا پھر اس کی ذاتی کد و کاوش نے تسخیر کا جال بچھایا تھا۔

وطن کی محبت کسی ایک انسان سے مخصوص نہیں بلکہ ہر شخص اس کی محبت کے جال میں پھنسا ہوا ہے اس کا ثبوت کہ انسانی محبت کسی خطے کے اینٹ پتھر، در و دیوار یا باغ و راغ پر نچھاور نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق اس ماحول سے ہوتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی کا ایک دور گزار چکا ہے یہ ہے کہ جب دوسری جگہ سازگار ماحول مل جاتا ہے تو وہ وہیں کا ہو رہتا ہے اور رفتہ رفتہ پہلے ماحول کو بھولتا جاتا ہے لیکن اگر ماحول موزوں نہیں ہوتا تو وطن کی یاد سے تڑپاتی رہتی ہے۔

نسبتاً وطن کے لحاظ سے میں امروہہ ضلع مرادآباد کا رہنے والا ہوں سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد یہ حصہ ہندوستان میں شامل ہو گیا انگریز کے زمانے میں اس صوبہ کو یو پی کہتے تھے ہندوؤں نے اب اس کا نام اتر پردیش رکھا ہے امروہہ بریلی کمشنری میں سب سے بڑا قصبہ ہے مرادآباد سے دہلی جانے والی گاڑی کا تیسرا ریلوے اسٹیشن ہے سنہ ۵۰ء میں جب میں پاکستان آیا ہوں اس قصبے کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار تھی جن میں غالباً دس ہزار شیعہ تھے اب خدا جانے کیا ہے تقسیم ملک کے بعد سادات کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی آئی اور مختلف شہروں میں آباد ہو گئی۔

اگرچہ ۱۰ سال سے میرا وطن ثانی کراچی ہے مگر آج تک میں وطن اصلی کو نہیں بھولا اور مرتے دم تک بھولوں گا اور کیونکر بھولوں گا جب کہ میرے بہت سے جگر کے ٹکڑے اور خون شریک اعزہ و احباب وہاں ہیں۔

امروہہ سے مجھے اس لئے محبت نہیں کہ وہ دنیا سے کوئی نرالی سرزمین ہے، اس لئے نہیں کہ وہاں کے زمین و آسمان کچھ اور تھے۔ نہ تو وہاں کی آب و ہوا میں طلسمی اثرات تھے نہ وہاں کی زمین بجائے نباتات کے سونا چاندی اگلتی تھی نہ میری وہاں جاگیرداری تھی نہ حکمرانی نہ وہاں میرے قلعے تھے نہ محلات۔ ہاں جسے میرا دل ڈھونڈ رہا ہے وہ وہاں کا ماحول تھا جو آٹھ سو سال کی مدت میں ہمارے اسلاف نے بنایا تھا۔

کراچی میں اگرچہ وہاں سے کہیں زیادہ سامان راحت و آرام میسر ہے مگر وہ روحانی کیف کہاں۔ ایک خاندان کے دس ہزار افراد ایک جگہ آباد گھر سے گھر ملے ہوئے محلے قریب قریب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک۔ عزاداری کا روح پرور کیف عزاخانوں اور مساجد کی کثرت، ماتمی جلوس کی خاص شان الغرض ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حالی کی زبان میں کہتا ہوں۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

جو سرزمین آٹھ سو برس سے میرے اسلاف کا مسکن تھی آہ وہ انقلاب روزگار کے ایک ہی جھٹکے میں ہمارے لئے ایک غیر ملک بن گئی اور ایک خرمن کے دانے اور ایک شاخ کے پھول کہاں سے کہاں پہنچے

ساداتِ امروہہ کا مختصر حال

بنی امیہ اور بنی عباس کا نیا زمانہ دورِ حکومت سادات کے لئے بڑا صبر آزما اور انتہائی مصیبت ناک دور تھا ان بیچاروں پر اولادِ رسول ہونے کے جرم میں ایسے سخت دور آئے کہ ان کے تصور سے دل لرزتا اور روح چیخیں مارتی ہے۔ قدم قدم پر موت کا بھیانک چہرہ ان کے سامنے تھا۔ اہل حکومت کی نظر میں ان کے خون کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ملک کے ہر حصہ میں ان کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ صرف سید اور شیعہ ہونا ایک ایسا ناقابل معافی جرم تھا جو کبھی بخشا ہی نہ گیا۔ ان کے خون ناحق سے اپنے ہاتھ رنگنے والے سلطنت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔ ان کے خون کے گاروں سے دیواریں چنی گئیں ان کی کھوپڑیوں سے مسجدوں کی بنیادیں بھری گئیں ان کو زندہ دیواروں میں چنوایا گیا۔

غور کرو اس ستم پرور دور میں غریب سادات پر کیا گزری ہو گی۔ جان بڑی عزیز چیز ہے جس سے جس طرح بن پڑا نکل پڑا۔ بہت سے تو راستوں ہی میں ختم ہو گئے کچھ ایسے تھے جو گرتے پڑتے کسی گوشۂ عافیت تک پہنچ گئے ان ہی میں وہ بھی تھے جنھوں نے ہندوستان کا رخ کیا مگر کس طرح؟ فقیروں، قلندروں، درویشوں اور صوفیوں کے بھیس میں۔ جان کو لباس میں اور مذہب کو دل میں چھپائے ہوئے۔

بڑے بڑے علماء، فقہاء، اربابِ سلوک و ریاضت صاحبانِ زہد و تقوےٰ اسی سیلاب میں بہہ کر ہندوستان کے کنارے آلگے۔ کوئی ان کی صورتیں دیکھ کر یہ سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ یہ گلستانِ رسالت و امامت کے وہ کمھلائے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبو سے مشامِ ایمان کو تازگی ہوتی ہے۔

تقریباً آٹھ سو برس کا زمانہ گزرا کہ ایک صاحبِ کرامت ولی خدا امام زادے جن کا اسمِ نامی **سید حسین** اور لقب **شرف الدین شاہ ولایت** ہے خدا جانے کن حالات کے تحت سرزمین امروہہ تک پہنچ گئے۔ یہ امام علی نقی علیہ السلام کے صاحبزادے جناب جعفر تواب کی نسل سے تھے حسینی نقوی سید تھے ان کا اصلی وطن واسط تھا۔

اس نقطہ میں ہمارے لئے اب کشش باقی ہو اگرچہ اس مقدس سرزمین کی خاک چشم عقیدت کے لئے سرمہ بنانے کو بھی میسر نہیں اور نہ آج تک اس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا مگر خدا جانے کیا جاذبیت ہے کہ اس کا نام سن کر آج بھی روح میں بالیدگی ہونے لگتی ہے۔

ان ہی شرف الدین شاہ ولایت قدس سرہ کے قدموں کی برکت تھی کہ ان کی نسل نے اس کفر نواز ملک پر ایمان و معرفت کے چراغ جلائے۔

ہماری جو نسلیں امروہہ سے پاکستان آئی ہیں وہ بھی کچھ دن بعد امروہہ کو بھی طرح بھول جائیں گی جس طرح ہم واسط کو بھول گئے ہیں۔ زمانے کے انقلاب میں بڑی جادوگری ہے۔

امروہہ کب آباد ہوا اور اس میں کیا کیا انقلاب آئے اس کو مورخ بتائیں گے۔ میں امروہہ کی تاریخ نہیں لکھ رہا میری نگارش کا تعلق صرف سادات کے مختصر حالات سے ہے۔ مخدوم سید شرف الدین کے وقت سے واقعات پر کچھ تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس بستی کو اس وقت کچھ ایسی نمایاں خصوصیت حاصل تھی کہ عرب کا نامور سیاح **ابن بطوطہ** بھی اس کو دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ اور اس نے چند روز یہاں قیام کیا جیسا کہ اس کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے۔

جہت ممکن ہے انہیں بطور خاص اس چھوٹی سی بستی تک آنے کی زحمت محض اس لئے برداشت کی ہو کہ وہ مخدوم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرتے کیوں کہ وہ ایک صاحب کرامت بزرگ تھے اور ان کے خرقہ زہد و ورع کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی ورنہ مردوہہ میں ایسی کیا خصوصیت تھی جو اس نامور سیاح کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی۔

اب اگرچہ دنیا کا رنگ کچھ اور ہے اور سلوک و ریاضت اور صفائے نفس اور تزکیہ باطن کی خانقاہیں صدیوں سے اجڑی پڑی ہیں اور ان کی قدر دانی کا جوہر تہہ خاک پہنچ چکا ہے لیکن اس ظلمت کدۂ آفاق میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ اہل طریقت کے قدموں کی خاک چشم بصیرت کا سرمہ تھی۔ عام لوگوں کا کیا ذکر سلاطین روزگار ان کی بارگاہ قدس میں سر جھکانا باعث فخر اور ذریعہ نجات جانتے تھے اور درویشوں کے بوسیدہ بوریئے ان کو اپنی زریں مسندوں سے زیادہ قابل احترام نظر آتے تھے۔

لطیفہ۔ شیخ علی حزیں مجتہد رحمتہ اللہ علیہ علمی کمالات کے ساتھ میدان عمل میں سرِ دفتر روزگار تھے۔ گردش روزگار سے جب در بدر کی خاک چھانتے سرزمین بنارس پر پہنچے تو بستی سے دور ایک سنسان مقام پر جھونپڑی ڈال کر عبادت میں مشغول ہوئے مشک کی خوشبو چھپتی کہاں ہے لوگ پہنچنے شروع ہو گئے۔ شہرت نے نقارے بجائے تو راجہ کے محل میں بھی آواز گونجی۔ بڑے تزک و احتشام سے وہاں پہنچا اور جھونپڑی کے اندر جانا چاہا تو علی حزیں کے غلام نے جو دربان تھا روک دیا کہ بے اجازت نہیں جا سکتے جب اذن باریابی ملا تو راجہ نے بطور شکایت کہا۔ درویشاں را درباں نباید علی حزیں نے فرمایا۔ باید تا سگ دنیا نیاید۔ یہ تھا درویشی کا جاہ و جلال۔

مخدوم صاحب کی نسل دو بیٹیوں سے چلی وہی سادات امروہہ کے مورث اعلیٰ ہیں۔

ساداتِ امروہہ کی دُنیوی ترقی

کسی شہر کی شہرت اور ناموری اس کے اینٹ پتھر سے نہیں ہوتی بلکہ ساکنوں کے حکیمانہ اور شیخانہ کارناموں سے ہوتی ہے اسی خصوصیت نے ساداتِ امروہہ کو سلاطین ہندوستان کے درباروں میں امتیازی کرسیوں پر جگہ دی۔ اس چھوٹی سی بستی میں تقریباً دو سو منصبدار جو سادات کرام سے تھے۔ مختلف سلطنتوں میں اپنی دماغی صلاحیتوں اور بلند کرداریوں کے ڈنکے بجا رہے تھے جن میں سید محمد میر عدل (حیفۂ خمس) سید ابوالحسن بن سید محمد میر عدل، بیگ عبدالماجد اور سید عبدالغنی قاتی۔ دیوان سید محمود بن سید عبدالماجد وغیرہ اسی گلشن سیادت و بسالت اور چمنستان عظمت و جلالت کے گل سرسبد تھے۔

گونجتے تھے ان کے ڈنکے سے زمین و آسماں
ان کے چہروں سے برستا تھا جلالِ خسرواں

امروہہ کے آثار قدیمہ کے مضمحل نقوش آج تک ان کی جلالتِ شان کا پتہ دے رہے ہیں۔ دربار کلاں۔ کوشک۔ نوبت خانہ۔ قلعہ۔ شاہی چبوترہ وغیرہ محلوں کے نام۔ ان کی شاہانہ زندگی کی نشان دہی کر رہے ہیں

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

ہمارے اسلاف نے مختلف سلاطین کے عہدوں میں کیا کیا خدمات انجام دیں۔ اس کا

پتہ ان فرامین سے چلتا ہی جو ان کے اخلاف کے پاس آج تک موجود ہیں۔ اگرچہ وہ کاروانِ رفتہ کا غبار ہی سہی مگر ہماری چشم مباہات کا سرمہ ہے۔

قصص الاولین عبرۃ للآخرین

وہ پُر شکوہ زمانے اگرچہ ماضی کے دبیز پردوں میں منہ چھپائے پڑے ہیں مگر سینہ بہ سینہ روایات نے جو حالات ہمیں بتائے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سیادت کے خون کی گرمی ان کی رگوں میں کس حد تک تھی۔ شاہی فرامین کی سیاہی میں ان کے شجاعانہ کارناموں کی جو چمک ہے وہ اس نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ ان کی سپہ سالاری کا ڈنکا جب میدان کارزار میں بجتا ہوگا تو حریفوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہوں گی۔ اور یہی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار جب کرسی عدل و داد پر بیٹھ کر قضایا کا فیصلہ کرتے ہوں گے تو عدل نوشیروانی ان کے قلم کو بوسہ دیتا ہوگا اور جب داد سخاوت دینے پر آتے ہوں گے تو حاتم طائی کی سخاوت عرق انفعال میں ڈوب جاتی ہوگی ؎

ما نال نائلک السحاب و انما ‏ ‏ حمت بہ فصبیبہا الرحضاء

بادل کو ان کی سخاوت کہاں نصیب جو مینھ اس سے برستا ہے وہ ندامت کا پسینہ ہی

جو بادشاہ حسن خدمات کے معراف اور کمالاتِ انسانی کے جوہری تھے انہوں نے بڑی بڑی جاگیریں مرادآباد۔ سنبھل اور بجنور کے اضلاع میں ان کو دیں۔

سادات کی مذہبی حیثیت

آسمان گواہ اور زمین شاہد ہے کہ ایسے اندوہناک اور بلا خیز زمانے بار بار پلٹ کر آئے ہیں کہ لفظ شیعہ اسلامی تعصب کے سینے پر ایسی کاری ضرب تھی کہ ہمارے حریفوں کو اس کا برداشت کرنا دشوار ہو جاتا تھا ایسے ہلاکت آفریں ادوار میں شیعوں کو جان و آبرو بچانے کے لئے صرف ایک ہی سپر تھی جس کو ان کے ائمہ کی دور رس نگاہوں نے تقیہ کے نام سے ان کے ہاتھ میں دیدی تھی۔

مخدوم شاہ ولایت زمانہ کی ناسازگاری دیکھ کر اسی تقیہ کی آڑ میں زندگی بسر کرتے رہے بغیر اسکے نہ رجوع خلائق ہو سکتی تھی نہ عتاب شاہی سے امان مل سکتی تھی۔ **نواب آصف الدولہ** مرحوم کی عہد سلطنت تک مخدوم صاحب کی اولاد کا تقیہ میں ہونا پایا جاتا ہے یہ سپر پس پشت اس وقت آئی جب سرکار حجۃ الاسلام سلطان المتکلمین مولانا و مقتدانا **سید دلدار علی صاحب** قبلہ غفران مآب طاب ثراہ نے بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی۔ بادشاہ کی طلب پر سادات امروہہ کے کچھ نمایندے لکھنؤ پہنچے اور قبلہ و کعبہ سے ہدایت حاصل کی اور اعلان شیعیت پر آمادہ ہوئے اس کے بعد مساجد و عزاخانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی اب تک اہل سنت کے طریقے پر نماز وغیرہ ہوتی تھی اب جامع مسجد تعمیر ہو کر اپنی نماز جمعہ علیحدہ ہونے لگی۔

جاگیرداری

سلاطین کے عطیات کی برکت سے بحمد اللہ ہر گھر میں اجالا تھا اور زمینداری کا سلسلہ صدیوں جاری رہا جس کے بل بوتے پر شان و شوکت نے ان کے قدم چومے سطوت و ہیبت نے ان کے درباروں میں نوبت بجائی۔ رُعب داب نے قصیدہ خوانی کی۔ دولت و ثروت کی پریوں نے نئے نئے راگ الاپے عیش و عشرت کی رامشگروں نے دلفریب نہاچ دکھائے غرض دن عید تھا اور رات شب برات ہے

چار ابجہاں خوش تر از ہیں یکدم نیست کز نیک و بد اندیشہ و از کس غم نیست

مگر افسوس زمانے کے شعبدہ باز نے سعادت و اقبال کے قلعوں کی بنیادوں میں نحوست و غفلت کے پتھر بھی ٹھونس دیئے تھے کیسی زمانہ میں اس باغ کی بہار جتنی قابل دید تھی ایک وقت میں اتنی ہی زیادہ عبرتناک بن گئی۔

بیک ساعت بیک لحظہ بیک دم دگرگوں می شود احوال عالم

تلاطم خیز دریا کا پانی جب ندی نالوں میں تقسیم ہوا تو آخری دور میں چلوؤں سے پینے کی قابل رہ گیا اور بعض زاویوں میں تو خاک اڑنے لگی۔

اگر سایہ ایک جگہ جم کر رہتا۔ اگر چاندنی سدا بہار ہوتی اگر فصل بہاری میں جمود ہوتا اگر دولت ایک گھر کی ہو کر رہتی تو یہ دنیا کچھ اور ہوتی۔

زمانے کے ترکش میں تغیرات کے بے پناہ تیر ہیں اور وقت کے دامن میں ان گنت پتھر جن سے کلیجے فگار اور سر و سینہ زخمی ہوتے رہتے ہیں کون سا دل ہے جس سے کراہ نہیں نکلی اور کون سی آنکھ ہے جس نے آنسو نہیں بہائے۔

کتنے پھول کھلے اور مرجھا گئے کتنے آفتاب چمکے اور گہنا گئے۔ کتنے دریا چڑھے اور اُتر گئے کل جو تخت پر بیٹھا جھوم رہا تھا آج خاک پر بیٹھا سر پیٹ رہا ہے۔ کل کا درویش بے نوا آج کا شاہ کجکلاہ ہے۔

کیا ہے دنیا اک زنِ غدار و بے مہر و وفا | چھین لے جس میں نہ سلطاں پنجۂ رحمت سے گدا
پالتی ہو ناز و نعمت میں جنہیں صبح و مسا | حلق پر ان کے پھراتی ہے شمشیرِ جفا

فضل میں جن کو زمانے سے بڑھا دیتی ہے یہ
اپنے ہاتھوں خاک میں اُن کو ملا دیتی ہے یہ

میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دَور میں اس باغ کی جاتی بہار دیکھی تھی تروتازہ پھول کم تھے مرجھائے ہوئے زیادہ چمن میں کچھ تازگی تھی اپنی خوشبو وہ بھی کھو بیٹھے تھے البتہ عزیزانِ وطن کے طرزِ ماند و بود سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس راہ سے کوئی بڑا قافلہ گزرا ہے۔

محلے وہی تھے جو پہلے تھے۔ اکثر شاندار دیوانخانے اور دالان سہ دری والے مکانات بھی وہی تھے جو بزرگوں نے بنائے تھے مگر عظمت و اقتدار کا ہما اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا وہ مکیں اب نہ تھے جن کے اقبال کی دَر و دیوار پر چمک تھی اور جن کے وقار و ہیبت کا پہرہ دار دروازے پر بیٹھا تھا۔ ہر محلہ میں بحمداللہ سادات کی کثرت تھی اور اب بھی ہر بساط پر شاہی مہرے سادات ہی کے تھے باقی باشندے ان کے اسلاف کے خدمتگزار یا ان کی اولاد تھی جو ان کی شوکتِ رفتہ کے سلامی اور مجرائی تھے لیکن اپنے والیانِ نعمت کی صاحبی بگڑتی دیکھ کر وفاداری و اطاعت شعاری کے جذبات کا پارہ گرتا چلا جا رہا تھا۔

چند سال پہلے جو جھک جھک کر سلام کرتے تھے اب ان کی گردنوں میں تناؤ اور سینوں میں ابھار تھا جن میاں صاحبان کا نمک ان کے رگ و ریشے میں پیوست تھا اب نمک حرامی کے نشے میں ان ہی سے ہمسری کا دعویٰ تھا۔ پھر بھی جو کچھ تھا غنیمت تھا۔ اقتدار کی عمارتوں میں دراڑیں ضرور پڑ گئی تھیں مگر در و دیوار وہی تھے۔ یہ میرے بچپن کا دور تھا۔

مخدوم شاہ ولایت اور ان کی کرامت

اس زمانے کے مسلمانوں کی کوشش کا تمام تر سفینہ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم پر ٹکتا ہے جس کا مقصد اقتدار اعلیٰ حاصل کرنا، بینک بیلنس بڑھانا، شاندار کوٹھیوں میں رہنا ہے۔ مادیت چونکہ اپنے سولہ سنگھار کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر شیشہ جادو مار چکی ہے، اس لئے ان کی تمام تر دماغی صلاحیتیں اس کی نازبرداری میں مصروف ہیں، نتائج کی تلخیاں دبیز پردوں کے اندر ہیں۔

اس سے پہلے کہ عقل انسانی پر مغربی تہذیب کی چوٹ پڑے مسلمانوں کا رجحان روحانی تعلیم کی طرف زیادہ تھا۔ اس تعلیم کے مدارس کی عمارتیں کاشانۂ عشرت اور ایوان فرح و نشاط تو تھی نہیں بلکہ کوئی بے رونق سا حجرہ ہوتا تھا جس میں کوئی مرد متقی، زاہد و عابد، شب زندہ دار، صاحب کشف و کرامت ولی خدا درس دیتا تھا یہ تعلیم کتابوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ ان نورانی شعاعوں سے ہوتی تھی جو پیر کے دل سے نکل کر مرید کے دل تک پہنچتی تھیں۔

مریدوں پر تن آسانی اور ہوس رانی کے تمام دروازے بند کرکے صبر

وقناعت زہد وتوکل کی چار دیواری میں نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ اب مرید جو کچھ دیکھتا تھا وہ سر کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے۔ ضمیر کی توانائی بدن کی طاقتوں کو ایسا رکھ کر نچوڑتی تھی کہ شیطانی وساوس لوگ دُم بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔

ایسی خانقاہیں اسلامی حکومتوں میں جابجا پائی جاتی تھیں۔ ہر ایک کا پیر طریقت الگ ہوتا تھا اور طریقہ تعلیم جدا۔ ان ارباب سلوک طریقت کے مراتب بھی بلحاظ ریاضت وکرامت ہوتے تھے۔ ہماری دنیا سے ان کی دنیا الگ ہوتی تھی۔ بقدرتِ خدا وہ بے پردہ اسرار ان کو نظر آتے تھے جو ہم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ فاقے کرنے سوکھے ٹکڑے کھانے اور کمبل کے پھٹے پرانے خرقے پہننے میں ان کو وہ مزا آتا تھا جو ایک دنیا پرست کو ہفت اقلیم کی بادشاہت میں نہیں مل سکتا۔

حضرت مخدوم شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ ایک ممتاز اہل اللہ پاک باطن اور روشن ضمیر و صاحب کرامت بزرگ تھے۔ نہیں معلوم کیوں اور کس ذرائع سے ہندوستان پہنچے اور وہاں سے ان کے قدم مبارک سرزمین امروہہ پر آئے۔

سنا جاتا ہے کہ ان کے پیر طریقت نے ہدایت کی تھی کہ تمہاری ہدایت کا مرکز وہ خطۂ ارض ہوگا جہاں آم اور روہو مچھلی کثرت سے ہو چنانچہ مخدوم صاحب نے اپنے مکاشفات سے پتہ چلا کر ادھر کا رخ کیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جناب مخدوم صاحب ان مقدس ہستیوں میں سے تھے جن کا طریقہ سلوک و رشاد تمام صوفیائے کرام سے الگ تھا۔ وہ نقوی سید اور مذہباً شیعہ تھے وہ اس راہ سلوک رشاد کے سالک تھے جس کی داغ

امیر المومنین علیہ السلام نے ڈالی تھی۔

اگرچہ صوفیائے کرام کے تمام سلسلے قادریہ نقشبندیہ چشتیہ سہروردیہ نظامیہ وغیرہ اپنے طریقت کی آخری کڑی مولا علی علیہ السلام کو مانتے ہیں لیکن وہ طریقہ عمل میں اس شاہراہ سے الگ ہوگئے جو حضرت علی علیہ السلام کی تھی۔

امیر المومنین علیہ السلام کے تصوف میں نہ تو رہبانیت کو دخل ہے نہ حال و قال کا اور نہ اس مجذوبیت کو جس کا نقطۂ کمال بدن کی عریانی اور احکام شریعت سے کنارہ کشی ہے۔ طریقت کو شریعت سے الگ کرنا رقص و سماع سے وجد میں آنا اور اسے معرفت الٰہی کا زینہ قرار دینا اہل بیت رسول کا طریقہ نہیں۔ ان کے لئے نہ تمنائے خلافت تھی نہ روزہ ترک تھا، مگر نہ ایسا کہ علائق دنیا کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جائیں انہوں نے دین و دنیا کو سمو کر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو نہ اعراض عن الدنیا کا حامی تھا اور نہ انہماک فی الدنیا کا یہی رسول کی تعلیم اور اسلام کا لب لباب تھا۔ میں نے اپنی کتاب **اہل بیت اور منازل روحانیت** میں بڑی مکمل بحث اس موضوع پر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تزکیہ نفس کی ۴۰ منزلیں ہیں جو علمائے اخلاق نے فضائل چہارگانہ (حکمت وعفت و عدالت و شجاعت) کے تحت درج کی ہیں ان تمام منازل کو طے کرنے کے بعد سالک روحانیت کی پہلی منزل حق الیقین میں داخل ہوتا ہے اس کے بعد پانچویں منزل وجد ہے پھر جذب ہے پھر فنا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جسے بے خودی کہا جاتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر سالک کو اپنی خبر نہیں رہتی پھر وہ اپنے نفس کے لئے کوئی کام نہیں کرتا اس کے تمام اقوال و حرکات و سکنات مرضی الٰہی کے تحت ہوتے ہیں اور وہ اس

آیت کا مصداق بن جاتا ہے ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (میری نماز میری عبادت میری زندگی اور میری موت سب للہ ہی کے لئے ہے جو رب العالمین ہے) اس کے ساز دل سے نغمہ سنائی دیتا ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحتِ جاں طلبم وزپے جاناں بروم
در ہوائے رخ او ذرہ صفت رقص کناں | تا لبِ چشمۂ خورشید درخشاں بروم

حضرت مخدوم شاہ ولایت اسی منزل کے سالک تھے انہوں نے علائق دنیا کا بار اپنے سر سے اتار کر نہیں پھینکا تھا وہ تجرد پسند نہ تھے وہ سادھو، سنیاسی، جوگی یا رہبان نہ تھے وہ بی بی اور بچوں والے تھے۔

جن لوگوں نے انہیں سنی سمجھ کر عرس کا ڈھونگ رچایا ان کے مزار اقدس کے سامنے رنڈیاں نچوائیں قوالوں کی تان تھپک کر صوفیوں سے ٹھپک ٹھیا کرائی حال قال کی محفلیں جمائیں انہوں نے یقیناً ان کی روح مقدس پر ظلم کیا۔

چوں کہ سنی المذہب سلاطین کے عہد میں شیعیت کا اعلان ناقابل معافی جرم تھا لہٰذا التقیہ کی صورت میں زندگی بسر کی اور رجوع خلق کے لئے اپنے کو شیعہ ظاہر کرنا مناسب نہ جانا پیری مریدی کا سلسلہ چوں کہ مذہب امامیہ میں نہیں لہٰذا شاہ صاحب بھی اس طریقے کے تارک رہے۔

جن اولیائے کرام کے مزار ہندوستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں وہ یقیناً اگر شیعہ نہیں تو تفضیلیہ ضرور تھے اور اپنا پیر طریقت امیرالمومنین کو جانتے تھے مجبوراً تقیہ میں زندگی گذارنے کی وجہ سے لوگوں نے انہیں سنی قرار دے لیا ان کی تصانیف اور ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں محبت اہلبیت تھی۔

مخدوم شاہ ولایت کے قدموں کی برکت سے امروہہ میں اسلام و ایمان کی روشنی پھیلی روحانی کمالات مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار ہوتے ہیں بستی سے کچھ فاصلہ پر شاہ ولایت کی درگاہ ہے جو ایک لمبا چوڑا احاطہ ہے جس میں ایک طرف چھوٹی سی بڑدری ہے جو غالباً ان کی خانقاہ کی یادگار ہے اسکے آگے شاہ صاحب اور ان کی بی بی کی برابر قبریں ہیں پائین پا ان کی صاحبزادی کی قبر ہے ان کی قبر سے نکلا ہوا ایک درخت ہے جو غالباً شاہ ولایت کے زمانہ کا ہے اس کا پھل بھی عجیب ہے شکر چڑھے الائچی دانوں کی برابر ہوتا ہے ذائقہ میں ہلکا شیریں اس احاطہ میں بہت سے لوگوں کی قبریں ہیں اور احاطے کا باہر سادات کا بہت بڑا قبرستان ہے۔ پہلے یہ درگاہ بستی سے دور تھی۔ آبادی بڑھ جانے سے اب بستی سے قریب ہو گئی۔

تعمیر کے لحاظ سے تو کوئی خصوصیت نہیں مگر روحانی عظمت اور مرکز خیر و برکت ہونے کی وجہ سے اس درگاہ کا خاص مرتبہ ہے میرے بچپن میں اکثر اہل شہر پنجشنبہ کو شام کے وقت اس درگاہ میں فاتحہ پڑھنے ضرور آتے تھے رفتہ رفتہ یہ ذوق کم ہوتا چلا گیا۔ ماہ رجب شاہ ولایت کی تاریخ وفات پر سادات امروہہ کے ہر گھر میں دودھ کی یعنی مخدوم صاحب کی فاتحہ حلوہ پر ضرور ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولایت علیہ الرحمۃ والغفران کی ایک جیتی جاگتی یادگار آج بھی موجود ہے جو ان کے عند اللہ رسیدہ اور ولی اللہ ہونے کا پورا بیّن ثبوت ہے اور جس نے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس درگاہ کے احاطے کے اندر زہریلے سے زہریلا بچھو بھی ڈنک نہیں مارتا جس کا تجربہ ہزاروں بار ہو چکا ہے درگاہ سے باہر آکر وہی وہ نیش زن بن جاتا ہے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مخدوم صاحب کے دو فرزند تھے ان ہی دونوں کی نسل سے سادات امروہہ پھیلا

سادات امروہہ کا اقبال و ادبار

میں امروہہ کی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اپنے ٹوٹے پھوٹے روکھے پھیکے سوانح حیات لکھ رہا ہوں لہٰذا امور خانہ طرز نگارش سے بے نیاز ہو کر اپنا قلم چلا رہا ہوں پس جو کچھ سادات امروہہ سے متعلق لکھوں گا بکمال اجمال نہ تو تفصیل کا محل ہے ورنہ میری محدود معلومات اس کی مقتضی۔

دیکھا تو نہیں بزرگوں سے سنا ہے کہ جب اس باغ کی بہار شباب پر تھی اور سادات کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا تو سلاطین کا شاہانہ اقتدار ان کو سیدھی نظر سے دیکھتے ہچکچاتا تھا اور ارباب حکومت کا پندار ان کے سامنے سر جھکاتا تھا۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں ان کی چتون کا بل بہادروں کے پیچھے لڑتا تھا تمام شہر ان کے پنجہ اقتدار میں تھا دیگر اقوام کی تاب نہ تھی کہ میاں کے حکم کی تعمیل میں سر ہلا سکیں۔ میاں کی سواری جدھر سے نکل جاتی ہر طرف سے مجروں اور سلاموں کے پھول برسنے لگتے۔ حکومت انگریزوں کی تھی لیکن اقتدار اعلیٰ سادات کا مگر آہ "ہر کمالے را زوالے" و "ہر فرازے را نشیبے"

دنیا ایک حال پر نہ رہی ہے نہ رہے گی لہکتی لہکتی پھلواریاں لو کے ایک ہی جھونکے میں سوکھ کر رہ جاتی ہیں عیش و نشاط کی وہ نظر نواز شبستانیں جو رات بھر داماں باغبان اور کف گل فروش بنی رہتی ہیں صبح کو دیکھئے تو وہاں خاک اُڑتی ہے شادی کے نغمے نوحہ و ماتم کی آوازوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

قدرت کے اٹل قانون کے مطابق جب ہوا کا رُخ بدلا تو رفتہ رفتہ آفتابِ اقبال کی شعاعیں مدھم پڑنے لگیں اور ہیبت و سطوت کے نقار خانوں میں سناٹا چھا گیا میں نے اپنے بچپن میں جو دیکھا وہ سادات کے اقبال کا مغرب میں ڈوبتا ہوا سورج تھا۔ اس وقت تو صرف نتائج کی تلخی پیشِ نظر تھی۔ جب عقل میں چمک بڑھی تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اس زوال کے اسباب کیا تھے اور یہ پانسہ کیوں پلٹا۔ دنیا عالم اسباب ہے۔ جس میں علت و معلول اور سبب و مسبب اور مقدمات نتائج کا ایک نامتناہی سلسلہ ازل سے چلا آرہا ہے کوئی واقعہ بے سبب نہیں ہوتا۔

غور و فکر کے بعد چند اسباب سمجھ میں آئے۔

(۱) حسن خدمات کے صلے میں جو جاگیریں ملی تھیں وہ ترکوں میں تقسیم ہوتے ہوتے پہاڑ سے رائی بن گئیں اور اشرفیاں روپیوں پر آ گئیں اور روپیوں کے پیسے ہو گئے جو زمینداری کی لاج تھے۔ اس مالی کمزوری نے وقار کی چمک اچک لی لیکن یہ ایک غیر اختیاری صورت تھی جس پر کسی کو موردِ الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(۲) باوجود مالی کمزوری کے خاندانی رسم و رواج سے بدستور لپٹے رہنا اور اسلاف کی آن بان کو طرۂ امتیاز بنائے رہنا تباہی اور بربادی کو آواز دے کر بلانا تھا۔ اسلامی معاشرہ جن رسم و رواج کو اپنائے ہوئے تھا وہ نہ تو خدا اور رسول کا فرمان تھا نہ بزرگانِ خاندان کی وصیت تھی نہ ایسی مقدس یادگاریں کہ ہمیشہ سایہ کی طرح ساتھ چلیں وقت کا تقاضا تھا کہ ان بھوتوں سے جلد از جلد اپنا پیچھا چھڑا لیتے۔

(۳) ہندو ساہوکار جو سالہا سال سے اقتدار سادات پر ڈاکہ ڈالنے کے منصوبے بنائے بیٹھے تھے سیم و زر کے کیسے کھول کر میاں لوگوں کے سامنے بیٹھ گئے اور پکار پکا

کر کہنے لگے میاں روپیہ ہمارا ہمت آپ کی جتنا چاہیے خرچ کیجیے۔ میاں کی آمدنی کم رسوم وقیود کی پابندی کا استرہ ناک پر رکھا ہوا سودی قرضے سے ارمانوں کی محفلوں میں تفوق و برتری کی پریاں چھما چھم کرنے لگیں۔ جو قرضے لیا وہ غفلت کے تاریک تہ خانوں میں امانت رکھ دیا گیا جب سود در سود کے لپیٹوں میں خوب جکڑے گئے تو پھر لالہ تھے اور میاں ہزاروں کی جائداد سینکڑوں میں نیلام ہو گئی۔

(۴) سب سے بڑی مصیبت یہ آئی کہ جو زمینداری کانٹے پر کی اوس تھی اسی کے نشے میں جھومتے رہے اور کسب معاش کے کسی وسیلے کو اپنانا اپنے جھوٹے وقار کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ سمجھا۔

(۵) باوجود صاحبی بگڑ جانے اور افلاس کی کالی بلا سر پر مسلط ہو جانے کے زندگی کے وہ محبوب مشغلے باقی رہے جو ان کے لئے زہر میں بجھے ہوئے خنجر تھے۔

(۶) انگریزی تعلیم سے نفرت صنعت و حرفت سے وحشت۔ تجارت سے عداوت اور زراعت سے حقارت نے آمدنی کے تمام ذرائع مسدود کر دئے اور مستقبل کو ایسا تاریک بنا دیا کہ فلاح و بہبود کی ہلکی سی کرن نے بھی اس میں نہ جھانکا۔

الغرض اقبال کی پریاں جو مدت سے پر پرواز تولے بیٹھی تھیں یہ کہہ کر اڑی چلی گئیں

"خود کردہ را علاجے نیست"

یہی وقت تھا کہ نحوست و فلاکت کے بھوت دھما دھم گھروں میں کود پڑے اور صدیوں کے امیرانہ ٹھاٹ کو دانتوں سے چاب ڈالا۔

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزن تدبیر ساری عمر گر سیتی رہے

عمل سادات کے بعض زاویوں پر تبصرہ

ہمارے بعض تعلیم یافتہ نوجوان جو اپنے اسلاف کی زندگی کے بعض زاویوں پر سختی سے طعنہ زن ہیں ان کو احمق کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے لہٰذا ایسی چند باتوں کو بطور نمونہ پیش کر کے ان پر مختصر تبصرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) ایک بزرگ زمانۂ سابق میں پوتڑوں کے رئیس تھے جن کے نام سے امروہہ کا ایک محلہ "کٹرہ غلام علی" کے نام سے آباد ہے ان کے متعلق دو کہانیاں زیادہ مشہور رہیں۔ ایک یہ کہ ہر برسات کے بعد ان کے یہاں اشرفیاں سوکھتی تھیں تاکہ سیلن کا اثر دور ہو جائے چالاک نوکر جوتوں کے تلے میں موم لگا کر ادھر ادھر چلتے پھرتے جتنی اشرفیاں ان کی قسمت سے چپک جاتیں وہ نصیب دشمناں ہو جاتیں شام کو تولی جاتیں تو نوکر بتاتے اتنی سوکھ گئی ہے میاں کہتے ٹھیک ہے مشکوں میں بھر دو۔

دوسرے سردی کے موسم میں گیدڑوں کی آوازیں آتیں تو نوکروں سے پوچھتے یہ کیوں غل مچا رہے ہیں مزاج شناس نوکر کہتے سرکار سردی زیادہ ہے اور غریبوں کے پاس اوڑھنے بچھانے کو کچھ نہیں نہ روئیں تو کیا کریں حکم ہوتا لحاف بچھونے بنوا کر انہیں دے آؤ۔ گیدڑ کہاں اور لحاف بچھونے کہاں گیدڑوں کے صدقے میں نوکر جاڑے کے موسم میں گرما جاتے جب دوبارہ چیخ پکار سنائی دیتی تو نوکر بتاتے کہ اب یہ سرکار کو دعائیں دے رہے ہیں۔

دور کے دیکھنے والے کو واقعہ مذکورہ میں اس صاحب ثروت انسان

کے حد و حماقت و دور تک پھیلے نظر آئیں گے بلکہ دماغی توازن کی صحت بھی خطرے میں نظر آئے گی۔

لیکن مجھے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کا قایل ہوں اس تاریکی میں بھی کچھ روشنی نظر آتی ہو۔ بات یہ ہے کہ کوئی عمل جب تک جدت اور ندرت کا غازہ اپنے چہرے پہ نہیں ملتا شہرت عام اور بقائے دوام کو اس پر پیار نہیں آتا مذکورہ واقعات سے اول تو ان کی دولت کی بہتات کا ابدی اعلان ہو گیا۔ دوسرے ارباب عقل وفہم کو دعوت غور و فکر دی گئی کہ یا اتنا خزانہ کہاں سے آگیا عقل یہی جواب دیگی کہ سلاطین کی بخششوں کا ثمرہ تھا جو شاہی خانہ کارروائیوں کے سلسلے میں ملا ہو گا ورنہ امروہہ میں ذکر ئی سکہ زنی کا کارخانہ تھا جس میں اشرفیاں ڈھلتی ہوں اور نہ کوئی سونے کی کان تھی۔

میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہو کہ خدا کی محتاج مخلوق کی مدد کرنے کا یہ عجوبۂ روزگار ایک طریقہ تھا بھینقہ اور باقل جیسے شہیر روزگار احمقوں کے سوا اور کون ایسا دشمن عقل و ہوش ہو سکتا ہو جو اپنی دولت اس حماقت کے ساتھ لٹا دے یہ بات تو شاید دیوانوں ہی سے منسوب ہو سکتی ہو کہ اشرفیاں بیل جاتی ہیں۔ اور قیدیوں کو لحاف بچھونے درکار ہوتے ہیں ضرور اس میں کوئی مصلحت کارفرما تھی حسب معمول دیتے تو سخاوت کی ان پھلواریوں پر آب حیات کا چھڑکاؤ نہ ہوتا۔ وہ برسات کے سبزہ کی طرح چند روز میں سوکھ کر رہ جاتیں۔ شہرت عام کے تقاضے اس طرح نہ بچتے کہ ان کی آواز فضائے امروہہ میں آج تک گونج رہی ہے۔ عام بخششوں کے تذکرے چند روز رہ کر مرجاتے ہیں۔ ان کو عمر خضر کہاں نصیب

حاتم طائی اگر ایک ہی سائل کو چالیس دروازوں سے خیر دیتا تو اس کی سخاوت فلک شہرت کا آفتاب بن کر نہ چمکتی۔ سید غلام علی نے چند اشرفیاں یوں لٹا کر اپنی داد و دہش کا سکہ چلا دیا۔

(۲) ایک بزرگ کی عادت تھی کہ صبح سویرے دروازے کے سامنے والے کوچے کے بیچوں بیچ مونڈھا بچھا کر اور حقہ سامنے رکھ کر امیرانہ انداز سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے راہ گیر میاں کو سلام کہتے گزر جاتے۔ ایک روز قسمت کا مارا ایک اُپلوں کے بورے بھرے گلی میں آ گیا دیکھا تو میاں براجمان ہیں۔ دبی آواز میں کہنے لگا میاں ذرا ہٹ جاتے تو میں بورے نکال لیتا" "ہٹ جاتے" خودداری کے سر پہ فولادی ہتھوڑا تھا۔ ہنکارہ دے کر فرمایا "ہوں" "یعنی بغیر میرے ہٹے نکال لے جا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا سر کا بورا بھرا ہوا ہے۔ میاں کے گر جانے کا ڈر ہے۔

"گر جانے کا ڈر ہے" رعونت کی پشت پر ایک اور بم گرا۔ "ہم گر جائیں گے" گدھے کا بچہ غصہ سے خاندانی سطوت کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سیادت کی تیوری پر بل تھا۔ ڈپٹ کر کہا لے جا۔ ایک طرف سے نکال کر۔ اس نے ڈرتے ڈرتے خچر بڑھایا راستہ تنگ میاں بیچ میں۔ بورے کا دھکا لگا تو سیادت کا قلعہ بات کہتے زمین بوس ہو گیا۔ اگر مشیخت آڑے نہ آئی ہوتی تو ندامت کا پسینہ پونچھتے اُٹھتے۔ مگر وہ مردِ میداں وار خاک جھاڑ کر پھر مونڈھے پر آ بیٹھے اور آمرانہ لہجے میں فرمایا۔ پھر نکال دوسری بار بھی پندار کا رستم اکھاڑے میں چاروں چت ہو گیا۔ اب اگرچہ آواز کمزور پڑ گئی تھی مگر الفاظ زبان سے وہی نکلے "پھر نکال" دوبارہ کے لوٹ پھیر

میں جبت سے اُپلے جو گر پڑے تو بورا ڈھیلا ہوگیا اور قطب صاحب کی لاٹ زلزلے کے جھٹکوں سے بچ گئی۔ پانچ روپے انعام دیگر فرمایا صبح سویرے ادھر نہ آیا کر۔

(۳) ایک بزرگ کا واقعہ سنا گیا ہے کہ تیل کھانے سے بخار آگیا بتیل کی سیادت ناشناسی پر غصہ آگیا ایک روپیہ کا چار سیر منگا کر پلنگ کی پٹی کے نیچے رکھوایا اور نوکر سے فرمایا سُن جب پانی مانگوں تیل دینا۔ غرض رات بھر تیل اور میاں سے خوب جنگ ہوئی صبح کو اتفاقاً بخار اتر گیا۔ نوکر سے کہا جا اس لعین تیل کو کوڑے پر پھینک دے اور اس سے یہ کہہ دینا کہ اب کسی سید سے نہ الجھنا۔

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن کو سن کر لوگ ہنسیں گے اور جہالت اور تہور پر محمول کریں گے میں ان سے کہوں گا کہ ان واقعات کو سطحی نظر سے دیکھ کر کوئی نتیجہ نہ نکالئے ہر زمانہ کا ایک ماحول ہوتا ہے اور ہر معاشرے کا ایک تقاضہ یہ زمانہ سادات کے عروج کا تھا امروہہ کی تمام اقوام پر اپنے اقتدار کی دھمک بٹھانا چاہتے تھے اس ارادہ میں کامیابی اس وقت ہو سکتی تھی جب اپنی پر جگری اور دلیری سے دوسروں کو مرعوب کریں اور کچھ ایسے واقعات بنائیں جن سے ان کی سخت مزاجی کا گھر گھر چرچا ہوتا کہ پست اقوام سرکشی پر آمادہ نہ ہوں اور سب پر ان کی دھاک بیٹھی رہے۔ یہی وجہ تھی کہ صدیوں امروہہ پر ان کی حکومت رہی یہ دیوانگی نہیں تھی۔ جہالت نہیں تھی۔ سنگدلی نہیں تھی بلکہ ان کی یہ مزاجی کیفیت وقت کی ضرورت نے بنائی تھی ورنہ وہ نہایت نیکدل اور نیک طبیعت تھے اپنی رعایا اور نوکروں پر انعام و اکرام کی بارش کرنے والے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے والے ان کی داد و دہش اتنی ہوتی کہ ان کے نوکر مالدار ہو گئے۔

سادات کے مشاغل اور طرز ماند و بود

میں نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اس خزاں رسیدہ چمن میں گنتی کے چند پھول ایسے نظر آئے کہ جن میں اقتدار و عظمت کی ہلکی سی تری پائی جاتی تھی۔ امارت و وجاہت دولت و ثروت اپنی زندگی کے آخری سانس نکال رہی تھی اور اثر و رسوخ کے چراغ کا تیل بھی ختم کے قریب آ لگا تھا وقت کی تیز رفتار موجوں نے تزک و احتشام کو بہا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا، درباری کر و فر تو کب کا دم توڑ چکا تھا۔ ہاں مکان فارغ البالی کی آخری یادگار تھی کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں دو چار مردانے مکان صبح و شام کی پُر لطف صحبتوں کے لئے نہ ہوں۔

یہ پرانی طرز کے مکان تھے سہ دری کے آگے دالان یا دالان در دالان بیچوں میں کہیں کوٹھریاں تھیں کہیں نہیں۔ لمبے چوڑے چبوترے ان کے نیچے صحن نشست کا فرنیچر بد صورت چار پائیاں۔ کرسیاں کم مونڈھے زیادہ تختوں پر کہیں قالین کہیں جاجم کہیں دری۔ بس یہی سادی زندگی کا پُر کیف نظارہ تھا۔

صاحبان مکان کا یہ فرض تھا صبح و شام آنے جانے والوں کی حقہ اور پان سے تواضع کریں۔ یہ دونوں چیزیں صحبتوں کا جزو لاینفک تھیں بغیر ان کے جلسہ داری نہ تھی بلکہ فاتحہ خوانی کی مجلس تھی۔

چائے کا دستور بہت کم تھا ہاں فلک سیر افیونیوں کے جلسے میں چنڈو خانہ بھی تھا۔

گئی گزری زمینداری کی بدولت فی الجملہ فارغ البالی نصیب تھی۔ گاؤں سے غلہ گھی۔ گڑ۔ دودھ اور ایندھن آجاتا۔ بے منت غیرے اس پر خوش و ناخوش گزارہ تھا۔ بملازمت انگریز سفیدی کی برابر۔ تجارت نے میں ہمت۔ صنعت و حرفت صفر محض رہے زراعتی کاروبار وہ نوکروں چاکروں کے ہاتھوں میں تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی ایسی صورت میں سادات کرام کو فرصت ہی فرصت تھی۔ وقت گزاری اپنے لئے کوئی مشغلہ چاہتی ہے لہٰذا مجلس داری نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

اس صحبت کو گرم کرنے کے لئے ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹتیں علم مجلسی کے ماہر طلاقتِ لسانی کے جوہر دکھاتے۔ لطیفے سُنا کر اہل صحبت کے دل گدگداتے۔ محلہ محلہ کی خبروں پر تبصرے ہوتے۔ مختلف مسائل پر قیاس آرائیاں دماغی اپچ دکھاتیں۔ غرض یہ پرلطف صحبتیں گھنٹوں جاری رہتیں اسی سلسلے میں چوسر بھی بچھ جاتی۔ تاش کے پتے بھی نکل آتے۔

مختلف طبیعتوں کے ساتھ مختلف شوق بھی چپکے ہوتے تھے جیسے مرغبازی۔ بٹیر بازی کبوتر بازی۔ کنکیا بازی۔ کشتی۔ پٹے بازی۔ تاش بازی۔ کبڈی گلی ڈنڈا۔ یہ زندگی کے ایسے محبوب مشغلے تھے جن کے بغیر معاشرہ بے جان تھا۔ رات اور دن کے عزیز اوقات ان مشاغل پر قربان کرنا زندگی کا ایک ایسا کارنامہ تھا کہ ہر دوانے والا اس کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

یہ آپ تقریباً سو برس پہلے کی کہانی سنا رہا ہوں بحمد اللہ اب یہ نحوست کی گھٹیاں وہاں سے اڑ گئی ہیں وقت کے سود ہے نے جب دو ہر ہیں لگا کر مستقبل کو دکھایا تو ندامت کے پسینے ہاتھوں سے پونچھے اور غفلت کی نیند کا خمار ہلکا پڑا۔ مگر بہت کچھ کھو کر

صبح کے بھولے شام کو لوٹے تو مگر تہی دامن ہو کر۔

سادات کی زندگی کے اس منحوس دور کا ایک دوسرا رُخ بھی دیکھئے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جب آدمی کے پاس دولت آتی ہے تو خرچ کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ اور ان ہی سے انسان کے احساس و شعور کو پرکھا جاتا ہے۔ رسم ورواج کی پابندیوں کا فطرتِ انسانی کے لیے چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن میں انسان کو ہوس کی جرأت دکھانے کا موقع ملتا ہے جن میں ضروری اور غیر ضروری مواقع دونوں ہی شامل ہوتے ہیں لہٰذا عقل دوربین اور مستقبل شناس سے ایسے وقتوں میں مشورہ کی ضرورت ہے تاکہ غیر ضروری جذبات کی روک تھام ہو جائے۔ سادات امروہہ کے پاس جب تک دولت تھی شاید لایعنی رسم کی بجا آوری کا کوئی جواز کھینچ تان کر پیدا کر لیا جائے مگر ان اخلاف کے لئے جو تہی دستی کی زد میں آ چکے تھے بڑی احتیاط سے کام لینا تھا۔ وہ کالی بلائیں جنھوں نے سادات کو بری طرح چابا ان رسوم کی شکل میں چھائی ہوئی تھیں۔

ستواسا جب بچہ نئی دلہن کے پیٹ میں سات ماہ کا ہو۔ آٹھواں سا جب ۸ ماہ کا ہو جائے۔ ولادت، چھٹی، عقیقہ (چلہ) منگنی، نکاح، بیاہ، پھیرے، چالے، ولیمہ، شب برات بھی ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جن میں خرچ کرنا ناگزیر ہوتا ہے مگر اپنی حیثیت اور حالت کو بھلا کر نہیں وقت کے تقاضے کو نظر انداز کر کے نہیں لیکن جہاں یہ عقیدہ ہو کہ پرانی رسموں میں سے کسی رسم کا چھوٹ جانا سو بلاؤں میں لا پھنسائے گا وہاں عقل کی بات کون سنے گا اور سیلاب کی طرح آنے والے افلاس سے کون بچائے گا چنانچہ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی کل آنے والا افلاس آج ہی آ گیا۔

اسلاف نے جو کچھ کیا اخلاف کو اس کا پابند ہونا ضروری نہ تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا زمانہ اور تھا انہوں نے اگر جوت کی جوت دکھائی تو اس کے لئے ایک جواز کا پہلو نکلتا ہے۔

ہر زمانہ کا ایک جداگانہ تمدن ہوتا ہے مخصوص معاشرت ہوتی ہے جداگانہ رسم ورواج ہوتے ہیں۔ ماحول کے اثرات ہوتے ہیں۔ درباروں کی مجبوریاں ہوتی ہیں ایسی صورتوں میں ماحول کے دائرے سے باہر نکل جانا ذاتی وقار پر چوٹ دیتا ہے۔ اہل امروہہ کے اسلاف نے دہلی کے بادشاہوں کے دربار دیکھے تھے جہاں دن عید تھا اور رات شب برات۔ انہوں نے وہاں شادی بیاہ وغیرہ کی رسموں کو للچائی نظروں سے دیکھا تھا شہزادوں اور امیرزادوں کی مجالست و مصاحبت کے منظر افروز منظر نگاہوں میں سمائے ہوئے تھے دل ودماغ ان سے کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے لہذا ریٹائرڈ ہو کر جب اپنے وطن میں آئے تو بقدر امکان ان رسموں کی نقل کر کے اپنے ہموطنوں کو شاہانہ مراسم سے آگاہ کیا۔

محمد شاہ بادشاہ دہلی کی رنگین طبیعت نے سارے دربار پر عیاشی کا رنگ جما دیا تھا جس سے بوڑھے کھوسٹ جوانوں کی طرح چھیلا بنے پھرتے تھے۔ یہ رنگیلے چھبیلے درباری جب اپنے وطن جاتے تھے تو یہی رنگ ہر طرف چھڑکتے تھے۔ یہ ہی صورت اودھ بادشاہوں کے یہاں بھی پائی جاتی تھی کیونکہ سلطنت درویشوں کا بوریا نہیں ہوتی بلکہ ہوس رانی اور عیش کوشی کی زرنگار مسند ہوتی ہے جس کے سامنے حسن کی دیویاں اور عیش ونشاط کی پریاں چھما چھم ناچتی ہیں۔

چو سر گنجفے سیر وشکار عشق و محبت وغیرہ امیروں کے دلچسپ مشغلے ہوا کئے

کرتے ہیں وہاں قرآن نہیں پڑھا جاتا بلکہ دل نواز اور نظر فروز کھیل تماشے ہوتے ہیں جہاں تمسخر ناچتا اور ظرافت قہقہے لگاتی ہے۔

ایسے معاشرہ کا تعلق صرف سادات امروہہ ہی سے نہ تھا بلکہ جہاں تک شاہی دولت کی بکھیر تھی وہاں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ یہی راز تھا کہ سادات امروہہ ان لایعنی مشاغل کا شکار ہو گئے۔ عام قاعدہ ہے کہ رسمیں اور روایتیں جس قدر آگے کو بڑھتی جاتی ہیں ان کا وزن بھی بھاری ہوتا جاتا ہے آخر کار وہ مذہبی عقاید کی صف میں اس طرح آ بیٹھتی ہیں جیسے شیطان ملائک کے بیچ میں آ بیٹھا تھا جب ان رسوم کی جڑ اس حد تک جم جاتی ہے تو پھر ان کا معاشرے سے جدا کرنا ایسا سخت ہو جاتا ہے جیسے ہڈی سے گوشت جدا کرنا، عورتوں کا کیا ذکر ان کے ترک کے تصور پر مردوں کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک فطری امر ہے کہ باپ دادا کی عظمت کے پیش نظر ان کے آئین و اطوار میں ایک گونہ وقار ہو جاتا ہے اور اس کے ترک میں ذلت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ادب اور احترام یہ کہ نسلی امتیازات کو لوگ بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اپنی عقیدت کے سینے سے لگائے رکھتے ہیں چاہے مشکلات کا کیسا ہی سامنا ہو۔ رسی جلنے پر بھی اس کے بل نہیں جاتے۔

گئی گزری حالت پر بھی ان لایعنی مشاغل سے چمٹے رہنے کے کچھ اور اسباب بھی تھے اس زمانہ میں تعلیم کا چرچا عام نہ تھا نہ اسکول تھے نہ کالج نہ مدارس دماغوں میں روشنی آتی تو کہاں سے سوجھ بوجھ ہوتی تو کیسے کسب معاش کے وسائل پر غور ہوتا تو کیوں کر جنگ آزماؤں کی اولاد تھے۔ جاگیرداروں کی نسل تھے رگوں میں سیادت کا خون تھا۔ بہت سی خصوصیتیں باپ دادا سے میراث میں ملی تھیں۔

اسلامی سلطنت کا دور ختم ہو گیا تھا اب ایک غیر قوم کی حکومت تھی جس سے کوئی مذہبی و ملی لگاؤ نہ تھا لہٰذا اس کی ملازمت کی طرف رغبت نہ ہوئی۔ زمینداری بسر اوقات کا ذریعہ تھا اسی پر قناعت کئے بیٹھے رہے۔ بے کاری نے ارادوں میں ضعف اور حوصلوں میں پستی پیدا کر دی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا، اپنا گھر اور اپنا شہر، پھر کسب معاش کے وسائل پر نظر کیسے جاتی دیگر اقوام کی ترقی سے سبق کیسے حاصل ہوتا اور لایعنی مشاغل سے چھٹکارا کیسے ملتا۔

کاشتکاری سے دلبستگی اس لئے نہ ہوئی کہ یہ زمینداری کی توہین تھی کہ ایک ایسے کاشتکار کی برابر کھڑے ہو کر ہل چلائیں جو ان کی رعیت ہو۔ سیادت کی تمکنت کو یہ ذلت گوارا نہ ہوئی۔ نفسیاتی اعتبار سے اس خودداری پر الزام نہیں لگایا جا سکتا شریف آدمی مرجاتا ہے مگر کسی قیمت پر اپنی عزت بیچنے پر تیار نہیں۔

کوئی پیشہ اس لئے اختیار نہ کیا کہ اس سے آبائی اقتدار حقارت کے پھیروں سے کچلا جاتا۔ شہر کے تمام پیشہ ور ان کے دسترخوان نعمت کے زلہ ربا اور ان کی دولت و اقبال کے دعا گو تھے ان کے نمک خوار تھے میاں میاں کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ غیرت نے تقاضا نہ کیا کہ انہیں استاد بنا کر سیکھیں ان کے نخرے جھیلیں اور اپنی سطح ان کی برابر کر کے کمائیں۔

تجارت اس لئے نہ کی کہ وہ بنیوں بقالوں کا کام تھا حمیت و خودداری نے اجازت نہ دی کہ ترازو باٹ لے کر بیٹھیں اور بنئے کہلائیں۔

وقت نے اگرچہ یہ سب کچھ کرا دیا مگر اس وقت نہ ہوا جب ترقی کے امکان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ تغیرات کی پوٹ ہے وہ کسی قوم کو ایک حالت پر نہیں رہنے دیتا

سیدانیوں کا پردہ

تقسیم ملک کے بعد امروہہ کی سیدانیوں کا پردہ اگرچہ پہلا سا تو نہ رہا تھا۔ تاہم غنیمت تھا دن میں کوئی سیدانی برقع یا چادر اوڑھ کر نہیں نکلتی تھی کنبہ میں جہاں جانا ہوتا ڈولی میں جاتی رات کو البتہ چادر یا برقع میں سرتاپا پوشیدہ عزیزوں میں چلی جاتیں بازار سے سودا لانے۔ مردانہ پارٹیوں میں شریک ہونے کھلے منھ پھرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ امرا کی عورتیں تو رات کو مجلس محرم و چہلم میں شرکت کے لئے بھی ڈولی میں آتیں۔ اسٹیشن پر ڈولی میں جاتیں۔ جابجا محلوں میں کہاروں کی سرائیں اور اڈے تھے قریب کے محلوں میں جاتیں تو دو پیسے سواری دور جاتیں تو چار پیسے۔ ڈولی چار بالشت لمبی اور تین بالشت چوڑی ہوتی تھی۔

اب کہ مغربی تہذیب کی ڈائن اسلامی تہذیب کو نگل گئی ہو یہ چیزیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں اب پردہ کی تائید میں کچھ کہنے والا انتہائی احمق سمجھا جاتا ہے افسوس جبکہ شریف زادیوں کے صرف چہرے ہی نہیں بدن بھی کھل گئے۔ فیشن ایبل برقعے اب جسم پوشی کے لئے نہیں بلکہ وہ زرق برق لباس کے لئے گرد پوش ہیں۔

آہ کہاں گئی وہ اسلامی تہذیب وہ فاطمی حیا و غیرت۔ میں ذکر کر رہا ہوں امروہہ کی سیدانیوں کا وہاں تو خیر کچھ کانٹے پر کی اوس تھی اور اب بھی ہو لیکن پاکستان میں آ کر تو وہ ایسی بدلی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں۔ اس سلسلے میں زیادہ لکھنا عبث ہے۔

ع طوطی کی کون سنتا ہے نقار خانے میں۔

امروہہ کے معاشی حالات

پچھلا زمانہ یاد آتا ہے تو سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے میرے بچپن میں کیا اچھا وقت تھا کہ ہر شے سستی تھی۔ اس زمانے کا روپیہ کتنا بھاری تھا جواب کے سو روپے سے کچھ ہی کم ہوگا ایک روپے کے سولہ آنے یعنی ۶۴ پیسے ایک پیسے کے چار چھدام ایک چھدام سولہ کوڑی کا۔ ایک پیسے میں چار سودے۔ چھدام کا گھی۔ چھدام کا گڑ۔ چھدام کا نمک اور چھدام کی مرچ۔ ایسے سودے دکاندار تول کر کب دیتا تھا مٹھی بھر بھر کر دامن میں ڈال دیتا تھا۔

اس زمانے کے نرخ سن کر اس زمانہ والوں کو مشکل سے یقین آئے گا یا ہے ستر پچہتر برس پہلے کے نرخ ہیں۔

گندم ۱۹ سیر۔ چنا ۱۸ سیر۔ جوار باجرا ۲۲ سیر۔ گھی ۱ سیر۔ گڑ ۷ سیر۔ شکر سفید ۳ سیر۔ دودھ ۳ سیر۔ گوشت بکری کا ۴ر سیر۔

گوشت گاؤ ۲ر سیر۔ اعلیٰ قسم کے انڈے ۵ ایک آنے۔ مٹی کے گھڑے ۵ ایک آنے۔ لکڑی جلانے کی ایک روپیہ کی ۴ من۔ شلجم مولی ایک پیسہ کی چار سیر۔

ساگ ۲ پیسہ سیر۔ ململ باریک سوتی ۴ر گز۔ ململ لٹھا زیون ۲ گز۔ عمدہ لٹھا ۳ گز۔ ۵ر گز۔ معمار و بہشتی کی مزدوری ۳ر ماہینہ۔

شیروانی گرم کی سلائی ایک روپیہ ۱۲ر یا دو روپیہ۔ ٹھنڈی کی سلائی ۱۲ر۔

گیا اب یہ زمانہ لوٹ کر آئے گا اب ہر شے کا نرخ امروہہ میں بھی وہی ہے جو دلی میں ہے اس وقت تین چار روپیہ ماہوار میں ہر شخص آرام سے گزار لیتا تھا۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ جوں جوں زمانہ آگے کو بڑھتا گیا وہاں بھی گرانی بڑھتی گئی اور اب تو کچھ پوچھے نہیں ایک روپیہ سیر آٹا ہے۔

امروہہ میں آموں کی بہار

آموں کی فصل اہل امروہہ کے لئے بہار کا موسم تھا۔ بکثرت آموں کے باغ تھے تخمی اور قلمی دونوں۔ فصل پر باغوں کے مالک اس کی بہار بیچ ڈالتے تھے جیسا باغ اور جیسی آموں کی تعداد ویسی ہی قیمت۔ اس وقت باغ والوں کے پاس بڑی بڑی رقمیں آ جاتی تھیں۔

کسی محلہ یا کسی کنبہ کے چند آدمی مل کر کسی باغ کی بہار خرید لیتے تھے بیچنے کے لئے کم کھانے کے لئے زیادہ۔ باغوں میں جھونپڑیاں ڈال کر رات دن وہیں رہتے تھے باغوں میں بلا کر احباب کی دعوت کرتے تھے تحفے میں لوگوں کو آم بھیجتے تھے برسات آئی باغ میں رہنے کا لطف ایک سے ہزار ہو جاتا۔ پھوار پڑ رہی ہے ٹپ ٹپ آم گر رہے ہیں لوگ جھولیاں لے چنتے پھر رہے ہیں بوریاں ٹپک رہی ہیں جھولے پڑ رہے ہیں۔ ملہار گائے جا رہے دادرے بج رہے۔ غرض ایک عجیب پرکیف سماں ہوتا تھا۔

شام کو آموں سے بازار پٹ جاتے تھے۔ تخمی آم عمدہ ہوتے تو ۲ر سیر معمولی ہوتے تو ایک آنہ سیر اور گھٹیا ہوتے تو دو پیسہ سیر۔ رات کو جب بچ رہے تو آواز لگی دو پیسہ دھڑی (پانچ سیر) پھر بھی بچ رہے تو آواز لگی لوٹ لے جاؤ۔

جو باغ ریلوے لائن کے قریب ہوتے ان کی بیج کی بہار اکثر ریل سے مسافروں کے ڈبوں میں ڈال دی جاتی۔ قلمی آموں کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو امروہہ میں ہو یہ باغات زیادہ تر سادات کے تھے۔

شادی و بیاہ

سادات امروہہ اس اصول پر سختی سے پابند تھے کہ وہ رشتے ناطے آپس میں کرتے تھے بالخصوص لڑکی تو باہر دیتے ہی نہ تھے اگر شاذونادر کوئی باہر کی بہو آجاتی تھی تو وہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ تحفظ نسل کا یہ طریقہ اچھا تو تھا لیکن اس بنا پر کہ دوسرے لوگوں سے بھی میل ملت بڑھے اور ان کے اثرات وغیرہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے تو زیادہ مفید نہ تھا۔

باہر شادیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب امروہہ کے تعلیمیافتہ نوجوان ملازم ہو کر دوسرے شہروں میں گئے اور وہاں اونچے خاندانوں سے روابط اور ضوابط پیدا ہوئے اور ان کی لڑکیوں کو صورت و سیرت و تعلیم و تہذیب میں اپنے یہاں کی لڑکیوں سے زیادہ بہتر پایا تو ان پر ریجھ گئے جب تک میرا قیام رہا ایسی شادیاں زیادہ تعداد میں نہیں ہوئیں۔

تعلیم نسواں کا چرچا وہاں بہت آخر میں ہوا کیونکہ سادات کا قدامت پرست طبقہ تعلیم نسواں کے خلاف تھا چونکہ وہاں تمام سادات ایک ہی دادا کی اولاد تھی اور سب آپس میں ملے جلے رہتے تھے لہٰذا رشتہ کی تلاش میں نہ تو ان کو زیادہ دقت پیش آتی تھی اور نہ تحقیق حال میں پریشانی ہوتی تھی چونکہ اعزازی اور مالی سطح قریباً ہموار تھی لہٰذا بڑی سہولت سے رشتے ہو جاتے تھے۔

شادیوں میں کئی کئی روز کنبہ جمع رہتا ایک ایک مہینہ پہلے لڑکی مانجھے (مایوں) بیٹھتی خاندان کی لڑکیوں کا اس کے گرد ہجوم رہتا گیت گائے جاتے۔

شادی کے دن ڈومنیوں یا میراثنوں کا گانا بھی ہوتا برات چلتی تو دولہا پالکی میں ہوتا براتی پاپیادہ ساتھ چلتے کیونکہ تھوڑی ہی دور تو جانا ہوتا تھا نکاح کے بعد چھوارے تقسیم ہوتے اور میراثی دونو طرف کا شجرہ پڑھتا۔

لڑکی والا براتیوں کے لئے کھانے کی دیگیں برات کی رخصت کے وقت لڑکی کے جہیز کے ساتھ دیتا تاکہ دولہا والے اپنے گھر جا کر براتیوں کو کھلائیں اس کو بھونڈا کہتے ہیں برات عموماً رات کو جاتی۔ شادی کے بعد دلہن کے پھیرے یا چالے ہوتے ہر چار روز بعد وہ میکے جاتی تین چار روز بعد جب سسرال آتی تو حسب حیثیت اس کے ساتھ کھانا بھیجا جاتا سوا مہینے کے اندر چار بار ایسا ہوتا اس مدت میں جب دلہن سسرال آتی تو سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اس کے سر پہ ایک بڑا سا کڑھا ہوا رومال پڑا رہتا وہ حیا کی ماری سسرال والیوں سے بہت کم بولتی۔ پشواز کی طرح کا ایک سرخ رنگ نیچے سے گھیرے دار لباس ہوتا جو گوٹے لچکے سے خوب سجا ہوا ہوتا۔ اس کا سسرال میں سوا مہینے تک پہننا ضروری تھا اس کو تلک کہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ نئی تہذیب کے اثر سے ان میں سے اکثر رسوم ختم ہو گئیں۔

یہ واقعات مختصراً اس لئے درج کر رہا ہوں کہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے رسم و رواج سے واقف رہیں ان مراسم میں ہندوانی رسموں کو بھی بدقسمتی سے دخل تھا جو بعد میں نکال دی گئیں۔

امروہہ کی عزاداری

عزاداری امام مظلوم شیعوں کی رگ حیات ہے جہاں کہیں ہوں اور جس حال میں ہوں عزاداری کرنا ان کا ایمانی فریضہ ہے۔ باوجود زمانہ کی انتہائی ناساز گاری کے وہ اس کو اپنی جان کے ساتھ لگائے چلے آرہے ہیں۔

تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ امروہہ میں عزاداری کا سلسلہ کب سے شروع ہوا قیاس کہتا ہے کہ نواب آصف الدولہ مرحوم کے زمانہ میں جب سادات نے تقیہ ترک کیا تو اسی وقت سے عزاداری کا اعلان بھی ہوا ہوگا۔

عزاداری کا جو طریقہ امروہہ میں رائج ہے وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے جہاں تک غم انگیزی کا تعلق ہے وہاں کے جلوسوں میں بہت سے پہلو اس کے لئے نظر آتے ہیں۔

میں نے ۱۹۵۰ء میں امروہہ چھوڑا تھا اس وقت زنانے اور مردانے عزاخانے تقریباً ۳۰۰ تھے محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی ہر عزاخانے میں مجلس کا آغاز ہو جاتا ہے جو وقت جس عزاخانہ میں مجلس کا معین ہے دس روز برابر اسی وقت پر وہاں مجلس ہوتی ہے۔ تیسری محرم سے جلوس برآمد ہونے لگتے ہیں وہاں کی اصطلاح میں جلوس کو ماتم کہا جاتا ہے۔

۳ محرم کو عزاخانہ محلہ بچپڑہ سے ۱۰ بجے دن کے جلوس برآمد ہوتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے ۴ محرم کو محلہ مچھر ہٹہ سے ۵ محرم کو محلہ سدو سے اسکو سقوں کا ماتم کہتے ہیں

ہوں میں ماتمی حلقہ یا دورہ نہیں ہوتا۔ ۹ محرم کو مسماۃ نوزن کے عزاخانے سے ساتویں تو کمرہ غلام علی کے عزاخانے سے۔ اسی تاریخ کو بوقت شام محلہ حقانی (بیجا میر محلہ) سے نشان اٹھتے ہیں جن کو جوڑیاں کہا جاتا ہے کیوں کہ دو دو علم ایک ساتھ دو آدمی لے کر چلتے ہیں یہ جلوس اسی محلے کے زنانے عزاخانے میں جاکر ختم ہو جاتا ہے۔

۹ محرم کو آخری جلوس عزاخانہ محلہ قاضی زادے سے برآمد ہوتا ہے چونکہ یہ آخری جلوس ہوتا ہے اس لئے آخر تک اس میں بکثرت مومنین شریک رہتے ہیں۔

۹ محرم کو بوقت شام محلہ دربار کلاں سے نشان اٹھتے ہیں جو ایک راستہ تما سے گزرتے ہوئے کنکوئی کے عزاخانے تک جاتے ہیں تمام شہر کے مومنین شرکت کرتے ہیں اب سے تقریباً چالیس سال پہلے تک جلوس کی واپسی پر محلہ مچھر ہٹہ، محلہ قاضی زادہ اور محلہ کنکوئی کے عزاخانوں میں تبرا ہوتا تھا لیکن بعد کو اسلامی رواداری کے پیش نظر بند کر دیا گیا۔

۱۰ محرم کو تمام عزاخانوں میں صبح سویرے مجلس ہوتی ہے اور بعد زوال کئی محلوں سے تعزیے نکلتے ہیں بعض تعزیے بہت بلند ہوتے ہیں کوئی لکڑی کا بنا ہوا کوئی بانس اور کاغذ کا۔ ہر تعزیے کے ساتھ ماتمی حلقہ ہوتا ہے جس کے آگے گھوڑا اور دیگر سامان عزا ہوتا ہے گھوڑے کے آگے دو علم ایک تلواروں کا دوسرے چھڑ کا ہوا ضرور ہوتا ہے جو تعزیہ جس محلے کے قریب گزرتا ہے اس کے رہنے والے ماتمی حلقے میں شریک ہوتے جاتے ہیں تعزیوں کی گشت شہر کے ایک خاص رستے سے ہوتی ہے کسی عزاخانہ میں یہ جلوس نہیں جاتا بلکہ راستے سے گزرتا چلا جاتا ہے راستوں میں جابجا چائے اور شربت پلایا جاتا ہے ملیدہ بھی تقسیم ہوتا ہے اہلسنت کے تعزیے بھی نکلتے ہیں مگر ان کے ساتھ ماتمی حلقہ نہیں ہوتا۔

جلوس کی شان

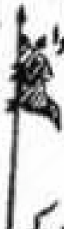
جس عزا خانے سے جلوس چلتا ہے وہاں لوگ ۹ بجے سے دس بجے تک جمع ہونے لگتے ہیں۔ ۱۰ بجے کے قریب مومنین حلقہ باندھ کر اور ایک دوسرے کی رومال سے بندھی کمر پکڑ کر سینہ زنی کرتے ہیں مخصوص مرثیے کے چند بند تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پڑھے جاتے ہیں گھومتا رہتا ہے تو صلوٰۃ کے بعد ماتم ختم کر دیا جاتا اور جلوس روانہ ہوتا ہے جلوس میں سب سے آگے چار پانچ اونٹ ہوتے ہیں جن پر بیٹھنے والے اپنے ساتھ من دو من تھوڑی روٹیاں رکھ لیتے ہیں جس کو توشہ کہا جاتا ہے۔ یہ تمام شہر میں جن راستوں سے جلوس گزرتا ہے تقسیم کرتے جاتے ہیں لوگ تبرک سمجھ کر اسکے مانگنے میں تکلف نہیں کرتے۔

اونٹوں کے پیچھے مختلف قسم کے تخت ہوتے ہیں بعض چھتری دار بعض بے چھتری کے ان کی تعداد کسی جلوس میں کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ۔ کہار ان کو لے کر چلتے ہیں۔

روشن چوکیاں یہ لکڑی بانس یا کسی اور چیز کے چھوٹے چھوٹے کمرے جیسے ہوتے ہیں چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے بعض میں نوبت بجتی ہے بعض میں تقسیم کے لئے پلاؤ کی دیگچیاں رکھ لیتے ہیں اور بطور تبرک لوگ مانگتے جاتے ہیں۔ اس کو تو کہار اٹھاتے ہیں۔ نالکیاں جو بطور شاہی ہوا دار کے ہوتی ہیں پھر ایک سرخ چھتر کا تخت ہوتا ہے۔ یہ شاہی کر و فر واسطے رکھا گیا ہے کہ امام مظلوم دین و دنیا کے بادشاہ تھے ظالموں نے ان کی قدر نہ کی یا پھر اس لئے کہ دہلی یا لکھنؤ کے سلاطین نے کسی شاہی جلوس میں یہ چیزیں دکھائی ہوں گی سادات امروہہ نے جو شاہی درباروں سے وابستہ تھے اپنے یہاں

ماتمی جلوس میں اس کو رواج دیا۔

چھوڑ کے ہوتے سفید کپڑے کے تخت کے پیچھے گھوڑا ہوتا ہے گھوڑے کے ادھر ادھر علم ہوتے ایک سفید کپڑے کا سرخ رنگ سے چھپڑ کا ہوا جس پر ایک سوکھی مشک اور بندھی ہوتی ہے اور اس میں تیر پیوست ہوتے ہیں دوسرا علم تلواروں کا ہوتا ہے جس میں دو تلواریں لگی ہوتی ہیں



گھوڑے کے پیچھے ماتمی لوگوں کی صفیں ہوتی ہیں جس کو دورہ کہا جاتا ہے ہر صف میں ۵ یا ۶ ماتمدار ہوتے ہیں ایک دوسرے کی کمر پکڑے ہوتا ہے ایسی قطاریں آگے پیچھے بکثرت ہوتی ہیں اگلی صف والے ایک نوحہ پڑھتے ہیں جس کے مصرعے تھوڑی تھوڑی دیر بعد دہرائے جاتے ہیں، شہید کربلا حسین۔ بے مونس و آشنا حسین، کشتۂ خنجر جفا حسین۔ نور دو چشم مصطفیٰ حسین۔ پیچھے کی تمام صفیں بیک زبان ہو کر کہتی ہیں حسین حسین حسین۔

محرم کے جلوس کی اس طرح ترتیب رکھی گئی ہے کہ کسی محلہ کا کوئی عزا خانہ باقی نہیں رہتا جب ایک محلے سے دوسرے محلے میں جاتے ہیں تو آرائشی سامان کہار کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیتے ہیں اور ماتمی حلقہ گھوڑے کو ساتھ لے عزا خانے کے اندر جاتا ہے اور گھوڑے کو اس جگہ جہاں عورتیں جمع رہتی ہیں زیارت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اور جب تک وہ واپس آئے مرد برابر عزا خانہ میں حلقہ باندھ کر سینہ زنی کرتے رہتے ہیں۔ ہر جگہ موسم سرما میں چائے کا اور موسم گرما میں شربت کا انتظام رہتا ہے۔

امروہہ کا چہلم

۱۳ محرم سے مجالس اربعین کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور مخصوص عزاخانوں میں ایک ایک عشرہ مجالس ہوتی ہیں جن میں علماء وعظ کرنے کے لئے باہر سے بلائے جاتے ہیں سلسلہ مجالس یوں رہتا ہے۔

۱۳ تا ۱۹ محرم وقت شب محلہ قاضی زادہ۔ ۲۰ تا ۳۰ محلہ کٹھی۔ ۱ تا ۹ صفر محلہ جعفری۔ ان مجالس میں تقریباً گیارہ سال میں پورا عشرہ پڑھتا رہا۔ اس عشرہ میں محلہ مجھ ہڑہ میں بھی مجالس ہوتی ہیں۔ ۱۰ تا ۱۹ صفر کئی عزاخانوں میں ہوتی ہیں۔

۸ بجے تا گیارہ بجے صبح محلہ گذری میں گیارہ بجے سے ایک بجے تک محلہ دانشمندان میں حاجی نور الحسن کے امام باڑہ میں ۴ بجے شام اسی محلہ میں بیچ کے امام باڑہ میں رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک محلہ حقانی۔ محلہ کٹرہ اور محلہ شفاعت پوتہ میں۔

۲۰ صفر کو ایک عزاخانے سے دو تعزیے برآمد ہوتے ہیں جو ایک مخصوص راستے سے گذرتے ہوئے کربلا تک جاتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دور پر ذیل کے مرثیے کے سلسلہ وار چند بند پڑھ کر آگے بڑھتے ہیں۔

قید سے چھوٹ کے جب سید سجاد آئے

مسجد نگرہ کے سامنے اس مرثیے کے آخری چند بند پڑھے جاتے ہیں اس کے بعد تعزیے کربلا کو چلے جاتے ہیں۔

امروہہ کے آثارِ قدیمہ

امروہہ سے چند میل دور ایک باؤلی ہے جس کو بانکا کنواں کہتے ہیں۔ ایک مرادآبادی دروازہ ہے۔ ایک مسجد شیخ سدو ہے جو شاہی عہد کی یادگار ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک قلعہ بھی تھا اگرچہ اب اس کا کہیں نشان نہیں مگر ایک محلہ قلعہ کے نام سے آج تک موجود ہے۔ محلہ نوبت خانے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دروازہ اس قلعے کا اس طرف تھا اسی کا دوسرا دروازہ وہ ہوگا۔ جسے مرادآبادی دروازہ کہتے ہیں۔

محلہ سدو کی مسجد کیقباد بادشاہ کے عہد کی ہے۔ ایک روایت سینہ بسینہ چلی آتی ہے کہ سدو نامی ایک عامل نے اس مسجد میں ایک عمل پڑھ کر ایک جن زین خاں نامی کو شیشے میں بند کیا۔ ایک رات کو وہ شیشہ ٹوٹ گیا اور اس جن نے آزاد ہو کر شیخ سدو کو قتل کرنا چاہا۔ شیخ نے بلجاجت کہا قتل تو کر دے لیکن میرے نام کو باقی رکھنے کی کوئی صورت نکال۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ جن دیہاتی لوگوں کو بالخصوص ہندوؤں کو دیوانہ کر کے لانے لگا۔ مسجد کے بیچ کے گنبد میں ایک زنجیر لٹکی ہوئی ہے دیوانہ اس کو چھوتے ہی اچھا ہو جاتا ہے۔ بدھ کے روز بکثرت زین خاں زدہ دور دور سے یہاں آتے اور اچھے ہو جاتے اب خدا جانے کیا صورت ہے۔

امروہہ کی جدید قومی عمارتیں

(۱) **جامع مسجد** - یہ مسجد محلہ شفاعت پوتہ میں، ہر اور کافی بلندی پر بنائی گئی ہے کل سادات کی اعانت سے بنی ہے تاریخ تعمیر "تعمیر کل جماعت" ہے بڑی شاندار اور کافی طویل و عریض ہے۔ اس کے مینار نہایت خوش نما اور اتنے بلند ہیں کہ میلوں دور سے نظر آتے ہیں تین گنبد ہیں نہایت خوب صورت اور تعمیر کے شاہکار مسجد کے اندر اور باہر نہایت خوش خط طغرے آیاتِ قرآنی کے جناب مولانا سید اولاد حسن صاحب قبلہ مرحوم اور جناب حافظ سید سبط احمد صاحب مرحوم کے تیار کردہ گنبدوں کے اندر اور در و دیوار پر ثبت ہیں۔ مسجد کا صحن کافی وسیع ہے۔ مسجد کے پہلو میں ایک عمارت لائبریری کے نام سے بنائی گئی ہے۔

(۲) **سید المدارس** - جامع مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ یہ مدرسہ عطیہ کرسی دے کر بنایا گیا ہے۔ امروہہ کے شیعوں کا یہ پہلا مدرسہ ہے جس میں اعلیٰ پیمانے پر دینی تعلیم کا آغاز ہوا۔

(۳) **عزاخانہ حاجی نور الحسن** بہت بڑا ہال ہے دو طرف غلام گردش ہیں۔

(۴) **آئی ایم انٹر سائنس کالج** - سادات امروہہ کی سب سے بڑی قومی عمارت ہی ہے جس میں ۵۰۰ طلبا تعلیم پاتے ہیں اس کی تعمیر کو مکمل کرانے اور انٹر کالج بنانے میں سید تقی ہادی صاحب ایڈوکیٹ و سابق ایم ایل اے کی کوششوں کو بڑا دخل ہے

(۵) **عزاخانہ محلہ مجلہ** بلحاظ عمارت تو کوئی خصوصیت نہیں۔ ایک دالان کے

گے ایک خوش نما سا تبان ہے بغلوں میں کمرے ہیں وسیع صحن ہے لیکن ایام محرم میں جب اس کو سجایا جاتا ہے اور شیشے کے جھاڑوں، فانوسوں اور شمعوں اور ہانڈیوں سے آرائش ہوتی ہے تو ایک خاص شان نظر آتی ہے اس عزا خانے سے زیادہ آرائشی سامان اور کسی عزا خانے میں نہیں۔

امروہہ کے صاحبان فضل و کمال

یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ قدر دانوں سے باکمال بنتے ہیں یا باکمال قدر دان بناتے ہیں پہلے خیال کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی جگہ کمال کے قدر دان موجود نہ ہوں تو وہاں باکمال لوگ پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ قدر دانی لوگوں کے دلوں کو گدگداتی اور شوق کی دبی چنگاریوں کو ابھارتی ہے تحسین و آفرین کا چسکا انعام و اکرام کی آرزو لوگوں کو کمال حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

سلاطین اودھ نے اپنی حکومتوں کے زمانے میں جو سب سے زیادہ باکمال پیدا کئے اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر صاحب فضل و کمال کے قدر دان تھے۔ باکمالوں کو بڑا انعام دیتے تھے۔ ان کو اپنا مصاحب بناتے تھے بڑے بڑے عہدے دیتے تھے۔ نواب نصیر الدین حیدر، آصف الدولہ اور نواب واجد علی شاہ کے زمانے لکھنؤ کے شباب کے زمانے تھے۔ دور دور سے باکمال سمٹ سمٹ کر وہاں آتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے لکھنؤ لکھنؤ تھا ورنہ جیسے اور

شہر ویسے لکھنؤ۔ کونسا صاحب کمال تھا جو اس سرزمین پر نہ پایا جاتا تھا بادشاہوں کی قدر دانی سے جو باکمال نہ تھے ان کو بھی باکمال بننے کا شوق پیدا ہوا۔ اور ریق چراغ سے چراغ جلتا گیا۔

دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ جب تک کوئی کمال بروئے کار نہ آئے قدردانی کیسی۔ کمال پہلے آتا ہے قدرداں اس کے پیچھے آتے ہیں جو پھول کھل کر مہکا نہیں جس مشک کی خوشبو ہوا میں بسی ہی نہیں اس کی قدردانی کیسی اگر لکھنؤ میں باکمال اپنے جوہر نہ دکھاتے تو سلطنت ان کو اپنے سینے سے کیسے لگاتی۔

یہ ضروری نہیں کہ بادشاہ قدر کریں تو باکمال پیدا ہوں جہاں صاحبان کمال ہوں گے قدردان خود کھنچ کر آجائیں گے۔ فردوسی جیسا باکمال ایک قریہ میں پیدا ہوا اس کی خداداد قابلیت کی نشوونما وہیں ہوئی۔ فردوسی نے محمود غزنوی کا درباری بن کر اپنا کمال نہیں دکھایا بلکہ اس کی شاعری کا چرچا سن کر خود محمود نے اسے بلایا باکمال انسان کسی کے بنانے سے نہیں بنتا بلکہ وہ خدا کے یہاں سے وہ صلاحتیں اپنے ساتھ لاتا ہے جن سے اس کے کمال کی نشوونما ہوتی ہے۔

خیر ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ حصول کمال میں کسی تمدن کے ماحول کو بھی دخل ہے انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اپنے کو نمایاں کرنا چاہتا ہے اور اس ماحول میں ترقی کی جتنی گنجائش ہوتی ہے اتنے ہی وہ پر پرواز مارتا ہے۔

یہ بھی ایک طے شدہ بات ہے کہ جب تک عمل کے نمونے سامنے نہوں ترقی کی رفتار بہت دھیمی رہتی ہے مقابلے کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے جب تک کسی صاحب کمال کے

مقابل کوئی دوسرا نہ ہو اس کی طبیعت بجھی سی رہتی ہے۔
امروہہ نہ تو کوئی دار السلطنت تھا نہ کوئی عظیم الشان شہر ایک چھوٹا سا مقام تھا وہاں کے ماحول نے شوق کے اجاگر کرنے میں اتنی ہی مدد دی جتنی اس کی طاقت تھی کوئی پرندہ اپنے بازو کی طاقت سے زیادہ بہت پرواز نہیں مار سکتا۔
تاہم بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی آبادی کے لحاظ سے جتنے باکمال اس سرزمین نے پیدا کئے وہ دوسرے مقامات کو میسر نہیں آئے میں ان میں سے کچھ لوگوں کا مختصر ذکر کرنا ضروری سمجھ رہا ہوں۔

ا۔ علما و فضلا۔ اب سے سو برس پہلے اور اس کے مابعد کا ذکر ہے کہ یہاں تحصیل علم کے لئے نہ کوئی ہمہ گیر ماحول تھا نہ کوئی خاص مرکز۔ زمینداری کے مشغلوں میں لوگ صرف بقدر ضرورت کچھ اردو فارسی پڑھ لیتے تھے۔
سب سے پہلے اس سرزمین پر جس نے اپنے علم و فضل کا ڈنکا بجایا وہ سرکار حجۃ الاسلام نجم الملت والدین شمس العلما جناب مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مرحوم و مغفور تھے یہ تو معلوم نہیں کہ امروہہ میں ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی چونکہ دینی تعلیم و تربیت کے لئے امروہہ کا ماحول سازگار نہ تھا اس لئے آغاز شباب میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں افقہ الناس ادیب بے مثال علامہ دوراں سرتاج عباد و زہاد مفتی سید محمد عباس صاحب طاب ثراہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ان ہی کی خدمت میں رہ کر درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے اس کے بعد ان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا۔ امروہہ میں یہ مرتبہ پھر اور کسی کو حاصل نہ ہوا۔

سرکار نجم العلماء نے مذہب حقہ کی وہ عظیم الشان خدمت انجام دی جس کی نظیر نہیں ملتی مدرسۃ الواعظین اور مدرسۃ ناظمیہ یہ دو نور درسگاہیں ان کی یادگار ہیں۔ ان سے بڑے بڑے فارغ التحصیل علما و فضلا ایسے نکلے جنھوں نے اپنی فضیلت کے ڈنکے بجائے اور مذہب حقہ کی بے نظیر خدمت تحریراً اور تقریراً کی۔

(۲) مولانا محمد حسن صاحب قبلہ مرحوم محلہ شفاعت پوتہ کے رہنے والے تھے امروہہ کے عمر بھر امام جمعہ وجماعت رہے بڑے مقدس اور عالم باعمل تھے زمینداری کی خاصی تعداد کے باوجود انتہائی سادگی سے بسر کی مجھے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔

(۳) مولانا سید احمد حسین صاحب قبلہ محلہ شفاعت پوتہ کے رہنے والے تھے۔ علم کلام و حدیث میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے فن مناظرہ میں کمال حاصل تھا چند سال سید المدارس امروہہ میں بہ حیثیت صدر مدرس علم کلام و حدیث و فقہ کا درس دیتے رہے۔

(۴) مولانا الحاج سید مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ مرحوم محلہ دانشمندان کے رہنے والے تھے علم صرف و نحو و منطق کے استاد تھے مدرسۃ نور المدارس میں بہ حیثیت صدر مدرس درس دیتے تھے درس دینے کے ایسے شوقین کم ہوتے ہیں۔ امروہہ کے ممتاز ذی حیثیت میں ان کا شمار تھا مختلف علوم کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ حاجی صاحب قبلہ نے اپنے پیسے سے خرید کر کے جمع کیا تھا۔

(۵) مولانا سید ولادت حسین صاحب قبلہ ان کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔

(۶) مولانا سید اعجاز حسین صاحب قبلہ مرحوم محلہ گذری کے رہنے والے تھے۔

امروہہ کے ممتاز رؤسا میں سے تھے فن مناظرہ میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اہلسنت کی تمام مشہور کتابوں پر ان کو پورا عبور تھا جو اہل ان کے بادشاہ تھے جس کسی کو مسائل نزاعیہ کے متعلق کوئی حوالہ درکار ہوتا مولانا نے تمام کتب اہلسنت سے نکال کر دکھا دیتے۔ غضب کا حافظہ تھا چند کتابوں کے مصنف بھی تھے جو ان کے صاحبزادہ کے نام سے چھپی تھیں فارسی میں زیادہ لکھتے تھے۔

(۶) مولانا سید باقر حسین صاحب قبلہ مرحوم محلہ بخشی کے رہنے والے تھے بڑے مقدس بزرگ تھے۔

(۷) مولانا سید جواد حسین صاحب قبلہ مرحوم۔ عربی فارسی زبان کے بے مثل ادیب تھے سرکار نجم العلماء سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کے داماد بھی تھے مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی تھی انگریزی میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ درسیات میں کمال حاصل تھا نہایت خاموش طبیعت منکسر المزاج اور تقدس سے بھرپور انسان تھے افسوس ہے کہ بحالت دیوانگی انتقال کیا۔

آہ! یہ سب راہی جنت ہو گئے اب ان میں سے کوئی باقی نہیں

مقدور ہو تو پوچھوں زمیں سے کہ اے لئیم
تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

(۸) مولانا سید یوسف حسین صاحب قبلہ مجتہد مولانا حاجی سید مرتضیٰ حسین صاحب کے فرزند اکبر تھے ۶ سال عراق میں رہ کر سند اجتہاد حاصل کی پہلے مدرسۂ منصبیہ میرٹھ میں صدر مدرس رہے پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں شیعہ دینیات کے ڈین مقرر ہوئے صحت خراب ہونے کی وجہ سے عین جوانی میں انتقال فرمایا۔

(۹) مولانا سید ابو جعفر صاحب مرحوم مولانا سید احمد حسین صاحب قبلہ کے فرزند اکبر تھے

(۱۰) مولانا سید محمد صاحب قبلہ مجتہد مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ کے فرزند ہیں علم کلام وحدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عراق گئے اور وہاں سے سند اجتہاد لے کر آئے۔ صاحب تصنیف ہیں اور پاکستان میں مقیم ہیں۔

(۱۱) مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ۔ سرکار نجم العلماء کے بھتیجے تھے۔ بڑے مقدس انسان تھے مدرسہ ناظمیہ کے ممتاز الافاضل تھے فقہ و اصول میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ عرصہ تک گیا میں امام جمعہ و جماعت رہے وہیں انتقال فرمایا۔

(۱۲) الحاج مولانا سید اعجاز حسن الحسنین صاحب قبلہ ممتاز الافاضل۔ عمر کا زیادہ حصہ کراچی میں گزارا مدرستہ العلوم سندھ میں شیعہ دینیات کے مدرس رہے۔ اب کراچی میں ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں بہت مقدس انسان ہیں۔

(۱۳) الحاج مولانا سید شبر حسن صاحب ممتاز الافاضل۔ ایک مدت دراز سے حیدرآباد سندھ میں مقیم ہیں۔ سندھ میں انہوں نے قابل داد تبلیغ کی ہے۔ چند سال سے حیدرآباد میں ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا ہے۔

(۱۴) مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ حاجی حرمین مولانا اولاد حسن قبلہ کے فرزند ہیں امروہہ کے امام جمعہ و جماعت ہیں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم ہیں۔

(۱۵) مولانا سید صفی مرتضیٰ صاحب مرحوم ایم اے عربی و فارسی زبان کے ماہر تھے بڑے نیک نفس اور پاکیزہ خصلت انسان تھے ان کے تقدس کا سادات امروہہ پر بڑا اثر تھا ماہ ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء میں حرکت قلب بند ہونے سے اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔

(۱۶) مولانا سید قمر حسن صاحب قبلہ ممتاز الافاضل تھے ادھیڑ عمر میں انتقال کیا

ان کے علاوہ وہ افاضل بھی تھے جنھوں نے یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کرکے اسکولوں اور کالجوں میں ملازمت کی تھی۔ عربی و فارسی زبان کے ماہر تھے جیسے مولوی سید تبارک حسن صاحب مرحوم فاضل (الہ آباد) اور منشی فاضل (پنجاب) مولانا شبیر حسین صاحب مولوی فاضل۔ مولانا بزرگ علی صاحب مولوی فاضل۔ مولانا ثاقب حسین صاحب (دانشمندان) مولوی فاضل۔ مولوی ثاقب حسین صاحب (قاضی زادہ) مولوی ممتاز حسین صاحب محلہ شفیع بڑا مقدس انسان تھا۔ عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ مولوی نور الدین احمد صاحب نہایت پاکیزہ نفس مولوی تھے وغیرہ وغیرہ۔

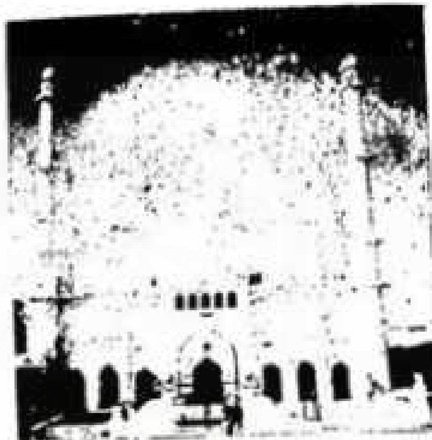
ایک قصبہ میں وہ وقت بھی تھا کہ اتنے عالم تھے اور اب یہ وقت ہے کہ سوائے مولوی محمد عادت صاحب کے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ افسوس صد افسوس۔

امروہہ کے اُدبا و شعرا

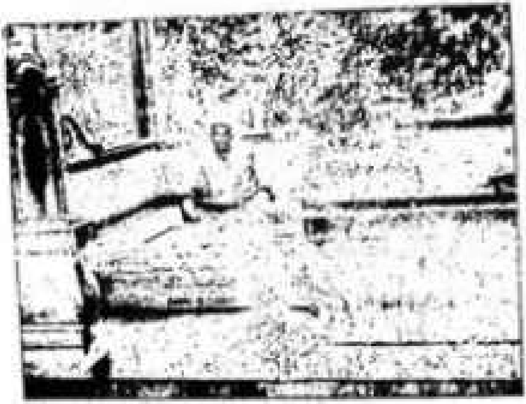
یہ وہی سرزمین ہے جس نے مصحفیؔ اور نقشؔ جیسے شعرا پیدا کیے۔ یہ گزر گئیں تو صرف ان ہی حضرات کا ذکر کروں گا جن کو میں نے دیکھا ہے۔

(۱) سید مومن حسین صاحب صفیؔ صاحب دیوان تھے ان کے خاندان میں تقریباً سب ہی شاعر تھے جن میں لائق حسین صاحب قویؔ نے زیادہ شہرت حاصل کی۔

(۲) مولانا سید اولاد حسن تسلیمؔ امروہہ کے بیشتر شعرا آپ سے اصلاح لیتے تھے۔



جامع مسجد امروہہ



درگاہ حضرت شاہ ولایت
امروہہ



سید شہنشاہ حسین
بی ایس سی



سید جعفر نسیم



سید فردوس شمیم
عرف آغا

(۳) سید ابوالحسن صاحب فرقتی ۔ صاحب دیوان تھے۔
(۴) سید حسن ضیا ۔ قصاید وسلام خوب کہتے تھے۔
(۵) سید جواد حسین صاحب شمیم ۔ مرثیہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ فرماتے ہیں۔

سمائے دبیر ایک ستارا ہوا پیدا ۔۔ دنیا میں شمیم سخن آرا ہوا پیدا

بہت سے مرثیے چھپ چکے ہیں۔ صنعت مراعاۃ النظیر کا بہترین استعمال ان کے یہاں پایا جاتا ہے اپنے صدر دروازہ کی تاریخ کیا خوب کہی ہے۔

ہوا القاب لطف شاہ خیبر ۔۔ شمیم حیدر یکتا کا ہے در

حیدر حسین صاحب یکتا ان کے والد کا نام اور یکتا تخلص تھا

ایک مدت تک نواب حامد علی خاں صاحب والی رامپور کے درباری شاعر رہے۔ شمیم صاحب فن سخن کے استاد تھے ان کی شہرت نے امروہہ کو چار چاند لگائے۔
(۶) سید بر جیس ۔ شمیم صاحب کے نامور فرزند تھے مرثیہ خوب کہتے تھے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔
(۷) سید آل احمد صاحب نعیم قصائد اور سلام خوب کہتے تھے۔
(۸) سید قائم رضا صاحب نسیم ۔ بن سید بر جیس بن شمیم امروہوی خاندانی شاعر ہیں اس باکمال سخنور نے وہ ترقی دکھائی کہ لوگ حیرت میں آگئے اب بحمد اللہ ان کو استاد فن کا مرتبہ حاصل ہے۔ صنعت مراعاۃ النظیر کا بے مثل استعمال نسیم صاحب کو ورثہ میں ملا ہے مگر ان سے کہیں زیادہ بہتر استعمال نسیم صاحب کے حصہ میں آیا ہے ان کے مراثی طبع ہو چکے ہیں تخیل و محاکات میں غیر معمولی دماغی صلاحیت سے کام لیتے ہیں مرثیوں کے چہرے کو نئے نئے موضوعات کے غازہ سے چمکایا ہے۔

نسیم کا مرثیہ پڑھنے کا انداز بڑا موثر و دلکش ہے۔ کراچی کے بہت سے شعراء کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

(۷) مولوی سید مجتبیٰ صاحب عرف مولوی چاند امروہہ کے نامور شعراء میں سے تھے۔ سلام قصیدہ اور مرثیہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

(۸) سید علی تمکین صاحب اپنے وقت کے دبیر تھے۔

(۹) سید شادمان علی صاحب شاد مرحوم مرثیہ کہتے تھے۔

(۱۰) مولانا سید شفیق حسن صاحب ایلیا امروہہ کے قابل ترین افراد سے تھے۔ نظم اور نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔

(۱۱) سید محمد مہدی رئیس، شاعری کے ساتھ فلسفیانہ دماغ بھی پایا ہے۔ نظم و نثر دونوں میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ جو کچھ قلم سے نکلتا ہے دلنشین ہوتا ہے۔ اخبار جنگ کراچی کے سب ایڈیٹر ہیں ہر روز اخبار میں ایک رباعی ان کی ضرور ہوتی ہے۔ ہر سال تقریباً تین سو ساٹھ رباعیاں لکھتے ہیں جب سے پاکستان بنا ہے ان کی رباعیوں کی تعداد دس بارہ ہزار تک پہنچ چکی ہوگی۔ دیگر نظمیں علیحدہ رہیں۔ کتنا قادر الکلام انسان ہے اگر کسی دوسرے شاعر کے ذمہ یہ گرہ لگائی جاتی تو دیوانہ ہو جاتا۔ انشاء اللہ خاں کے لئے بادشاہ نے ایک لطیفہ روز کی پابندی لگا دی تھی تو پاگلوں کی طرح لوگوں سے لطیفہ پوچھتے پھرتے تھے آخر دیوانے ہو ہی گئے۔

(۱۲) سید مطلین احمد صاحب سلام قصیدے خوب لکھتے ہیں تاریخ گوئی میں کمال حاصل ہے جامعہ امامیہ کراچی میں ان کی تاریخوں کے نمونے موجود ہیں۔

(۱۳) سید یحییٰ حسن صاحب پرنسپل آئی ایم کالج امروہہ بڑے مشاق انشاپرداز ہیں۔

مرثیہ خوان و سوز خوان

تحت اللفظ مرثیہ خوانوں میں سید ابن حید رضا صاحب مرحوم کو کمال حاصل تھا جب مرثیہ پڑھتے تو مجلس پر چھا جاتے تھے۔

۲۔ سید نذر سبطین صاحب مرحوم میر فدا علی کے رنگ میں جس میں نظم و نثر دونوں شامل ہوتے ہیں اور حفظ پڑھا جاتا ہے بہت خوب پڑھتے تھے اب ان کے جانشین ان کے فرزند سید ظل سبطین صاحب ہیں۔

امروہہ کے ہر محلہ میں یوں تو سوز خوان ضرور ہوتے تھے محلہ بنگلہ میں تو تقریباً ہر شخص سوز خوانی کرتا تھا سید گل حسن صاحب مرحوم اور سید آل حسن مرحوم نے اس میں کمال حاصل کیا تھا۔

امروہہ کے مصنفین

(۱) مولانا سید اعجاز حسن صاحب قبلہ جو کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مفاتیح المطالب تفسیر الآیات۔ تثبیت الاقران۔ تاریخ کربلا وغیرہ۔

(۲) مولوی سید آل محمد صاحب محلہ گذری۔ مولوی سید شفیق حسن صاحب محلہ لکڑہ۔ حکیم سید حمزہ علی صاحب محلہ لکڑہ۔ مولوی محمد عسکری صاحب محلہ جعفری۔ مولانا سید اولاد حسن صاحب قبلہ صاحب فقہ الفرائض منظوم۔ مولوی سید تبارک حسن صاحب۔

مولوی سید لشکر حسین صاحب۔ مولوی سید لقا علی صاحب

ڈاکٹر اور اطبآ

امروہہ کو اپنے حاذق اطباء پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ یہاں کے تمام اطباء مریضوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ تشخیص مرض کرنے کے بعد نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کرتے ہیں سنے جن اطباء کو دیکھا وہ یہ تھے۔

حکیم نیاز علی خاں صاحب۔ حکیم راحت علی خاں صاحب۔ حکیم ریحان علی خاں صاحب حکیم امداد علی خاں صاحب یہ سب ایک خاندان کے تھے۔ حکیم سید محمد صاحب حکیم میر احمد عرف اچھو صاحب حکیم ظ صاحب حکیم میر محمد صاحب۔ یہ سب ایک خاندان کے تھے۔ حکیم محمد مستحسن صاحب۔ حکیم ظفر حسن صاحب حکیم امیر حسن صاحب حکیم صغیر حسن صاحب۔ حکیم انور حسن خاں صاحب۔ حکیم اصطفےٰ حسن صاحب شاگرد حکیم شفاء الدولہ لکھنوی۔ حکیم سید صفدر نذر صاحب۔ حکیم نور نذر صاحب۔

ڈاکٹروں میں زیادہ مشہور تھے ڈاکٹر سید رضی الحسن صاحب۔ ڈاکٹر تہور حسین صاحب ڈاکٹر سلطان حسن صاحب۔ ڈاکٹر اظہر حسن صاحب۔ ڈاکٹر اختر حسن صاحب محلہ گذری۔ ڈاکٹر اختر حسن صاحب محلہ جھپوڑہ ڈاکٹر اختر حسن صاحب دانشمندان ڈاکٹر محمد حمید صاحب ڈاکٹر محمد عوض صاحب ڈاکٹر زیرک حسین صاحب۔ افسوس یہ سب پیوند خاک ہو گئے دو چار باقی رہ گئے ہیں۔

جس سلسلہ میں کچھ لوگوں کے نام چھوٹ گئے ہوں اسے میری بھول پر محمول کریں۔

وکلا مختار اور ارباب سیاست

سید ضامن حسین صاحب۔ سید ابرار حسین صاحب۔ سید سعید حسن صاحب سید مسیح الحسن صاحب۔ سید مظاہر حسین صاحب۔ حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ ساجد علی خاں صاحب۔ کاظم علی خاں صاحب۔ سید علی حیدر صاحب سید افسر حسن صاحب۔ سید آل محمد صاحب سید حسن صاحب ضیا۔ سید حسن صاحب سیاہ۔ سید حامد حسین صاحب۔ سید وصال محمد صاحب۔ سید تقی ہادی صاحب سابق ایم ایل اے۔ سید معز حسن صاحب۔ سید محمد نبی ہادی صاحب خان بہادر۔ سابق ایم ایل اے ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ چیرمین میونسپل بورڈ امروہہ۔ سید سجاد حسنین صاحب سابق چیرمین میونسپل بورڈ امروہہ۔

یہ تھی وہ باکمالوں کی محفل جسے چھوڑ کر میں آیا تھا۔ یہ تھا وہ باغ جس میں رنگ برنگ کے پھول میں نے دیکھے تھے۔ ایک چھوٹی سی آبادی اور اس میں اتنے باکمال فضیلت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں شیعیان امروہہ نے حصہ نہ لیا ہو افسوس ہے کہ اب یہ جمی جمائی محفل اجڑ گئی بہت سے لوگ مر گئے بہت سے پاکستان چلے آئے اور یہاں آکر اعلیٰ ترقیاں حاصل کیں جو وہاں ہیں وہ بھی بحمد اللہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں اللہ ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

میری

اسّی سالہ

سرگزشت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عہد طفلی کے چار پانچ سال چھوڑ کر جہاں سے قوت حافظہ اپنا عمل دکھاتی ہے میں اپنی زندگی کے مختصر نقوش صفحۂ قرطاس پر لا رہا ہوں ۷۵ سال کے دھندلکے میں میرے واقعات سر چھپائے پڑے ہیں اس تاریکی کے اندر سے واقعات کو کھینچ کر لانا کس قدر مشکل ہے خصوصاً قوت حافظہ جب کہ ایک بڑی حد تک جواب دے چکی ہے۔ بہر حال ایک حاطب لیل کی طرح جو ملتا جائے گا سپرد قلم کرتا جاؤنگا۔

ایک ایسے شخص کے لئے جو باکمالوں کی کسی محفل کا صدر نشین نہیں جو کسی اعلیٰ منصب پر فائز نہیں اپنے سوانح حیات کو پیش کرنا پسندیدہ جرأت نہ سمجھی جائیگی۔

میں امروہہ کا رہنے والا ہوں۔ میرا گھر محلہ حقانی میں تھا۔ یہ محلہ درگاہ شاہ ولایت سے قریب ہے۔ میرا مکان موروثی تھا جو بحمد اللہ اب بھی میرے ان دو لڑکوں کے پاس ہے جو اب تک ہندوستان کے باشندے ہیں۔ دوسرا مکان اس کے سامنے ہی ہے جو میں نے خرید کر از سر نو بنوایا تھا۔ ان مکانوں کے قریب ہی دیوار بدیوار میرے خاندانی عزیزوں کے مکانات ہیں۔

میرے والد کا نام سید دلشاد علی بن سید امداد علی بن سید حمایت علی ہے۔ چند پشتوں کے بعد ہمارا سلسلۂ نسل جناب امام علی نقی علیہ السلام کے صاحبزادے جعفر تواب سے مل جاتا ہے۔

دیگر اجداد اہل امروہہ کی طرح میرے اسلاف کے بھی کچھ قابل فخر کارنامے ہیں جن کو میں بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

جہاں تک میرے علم میں ہے میرے دادا سید امداد علی تک پہنچتے پہنچتے

زمینداری تقریباً ختم ہو چکی تھی جو باقی تھی وہ کاشتکار کی اوس تقی اور اطمینان سے بسر اوقات کے لئے ناکافی. میرے دادا صاحب کے دو بیٹے تھے سید ممتاز علی و سید دلشاد علی۔ اور چار لڑکیاں تھیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی اولاد کا ذکر کر دوں کیوں کہ میرے خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے کچھ لوگ پاکستان آگئے ہیں اور ان کی اکثریت امروہہ میں ہے اور ان سب کا اب یک جا ہونا ممکن نظر نہیں آتا لہٰذا کم از کم اتنی آگاہی تو رہے کہ فلاں شخص سے ہمارا نسبی تعلق کیا ہے اس طریقے سے تعلقات کی وابستگی باقی رہے گی اور خط و کتابت میں اجنبی صورت نہ ہوگی۔

اولاد سید ممتاز علی مرحوم

چار بیٹے دو بیٹیاں۔ سید ریاض حسن۔ سید مبارک حسن۔ سید سبط حسن۔ سید مسعود حسن زاہدہ خاتون واجدہ خاتون اب ان میں سے کوئی باقی نہیں۔

(۱) سید ریاض حسن لاولد مرے تین لڑکیاں یادگار چھوڑیں طیبہ خاتون مرحومہ آمنہ خاتون و طاہرہ خاتون۔

(۲) سید مبارک حسن صاحب ریاست گوالیار کے محکمۂ بندوبست میں ملازم تھے بڑے عاشق حسین اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ غریب رشتہ داروں کی حتی المقدور امداد کرتے تھے ایک بار اپنے تمام خاندان کو لاری میں لے کر ایران و عراق کا سفر کیا اور مشاہد مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا وہاں سے واپس آکر لکڑی کی ایک ضریح روضۂ امام حسین سے مشابہ تیار کرا کے محلے کے عزاخانے میں رکھی

ان کی اولاد تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ (۱) مولوی سید تبارک حسن مرحوم جن کی شادی آمنہ خاتون بنت ریاض سے ہوئی جن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی یادگار ہیں، سید متبرک حسن، سید ذوالفقار حسن اور ضامنہ خاتون۔

(۲) سید تبرک حسن اولاد سے محروم ہیں۔

(۳) سید زیرک حسن مرحوم نے عین عالم شباب میں انتقال کیا صاحب اولاد ہیں۔

(۴) میمونہ خاتون جو میری زوجۂ اولیٰ ہیں۔ رزنیہ خاتون جن کی شادی سید ناصر حسین محلہ دانشمند ان سے ہوئی صاحب اولاد ہیں۔

ج۔ سید سبط حسن مرحوم تین لڑکے اور چند لڑکیاں ان کی یادگار ہیں۔ قاسم حسن۔ کاظم حسن اور ہاشم حسن لڑکوں کے نام ہیں۔

د۔ سرور حسن لاولد رہے نوالیار میں انتقال کیا۔

ہ۔ زاہدہ خاتون زوجہ سید امیر حسن مرحوم ان کی یادگار دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں سید عمران حسن مرحوم۔ سید ذیشان حسن۔ سیدہ کسین دولت یہ میری زوجۂ ثانیہ ہیں۔

ز۔ واجدہ خاتون صرف دو لڑکیاں ان کی یادگار رہیں۔

(۲) اولاد سید دلشاد علی مرحوم

میرے والد ماجد سید دلشاد علی صاحب مرحوم کی شادی کٹرہ غلام علی میں سید گلزار علی صاحب کی صاحبزادی کنیز بتول صاحبہ سے ہوئی تھی جن کے بطن سے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔

(۱) راقم الحروف:

(۲) سید منظر حسن مرحوم ان کی شادی میرے ماموں کی پوتی شمیمہ خاتون سے ہوئی۔ جس کے بطن سے دو لڑکیاں اور چار لڑکے ہوتے۔ سید مظفر حسن۔ سید منصور حسن سید مزمل حسن و سید مجتبیٰ حسن نسیمہ خاتون، شبینہ۔ سب پاکستان میں ہیں۔

(۳) مومنہ خاتون مرحومہ زوجہ سید ضیا علی صاحب مرحوم ساکن محلہ کچہری میری بڑی بہن سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

۱۔ سید انور حسن فارسی اردو کے کئی امتحان پاس ہیں میرے ساتھ ہی پاکستان آگئے تھے۔ ماشاءاللہ ۵ لڑکوں اور ایک لڑکی کے باپ ہیں بڑا لڑکا اختر حسن بی اے پاس ہے دو لڑکے خوشتر حسن و کوثر حسن ڈپلوما پاس ہیں باقی دو زیر تعلیم ہیں۔

ب۔ قیصر حسن ہائی اسکول پاس صاحب اولاد ہیں۔

ج۔ مبینہ خاتون زوجہ سید ذیشان حسن (میرے برادر نسبتی) اس کے بطن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ سید سلمان حسن۔ سید ریحان حسن۔ سید ارمان حسن سید اقبال حسن حسین و دولت۔ مہ جبین۔ زہرہ جبین۔ لڑکوں میں صرف ایک کی شادی ہوئی ہے اور لڑکوں میں دو کی۔ یہ سب پاکستانی ہیں۔

(۴) عابدہ خاتون (میری منجھلی بہن) زوجہ سید انوار مہدی مرحوم یہ میری بہن بقید ہے اس کے تین لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ ایک جوان لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ لڑکے ہیں سید زوار مہدی سید اسرار مہدی سید ظہور مہدی۔ پہلے دو شادی شدہ ہیں لڑکیوں میں لیلیٰ اور کنیز فاطمہ لیلیٰ کی شادی ماسٹر سید مجلس علی حسن صاحب سے ہوئی۔ جس کے بطن سے کئی لڑکے اور لڑکیاں ہیں کنیز بیوہ ہے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی اولاد ہے۔

(۵) صابرہ خاتون زوجہ سید عمران حسن مرحوم یہ مرحومہ میری چھوٹی بہن تھی اس کے بطن سے تین لڑکے ہیں اور ایک لڑکی ؔ عارفہ خاتون جو عین جوانی میں فوت ہوگئی ۔ لڑکے یہ ہیں ۔ سید عرفان حسن ایم، اے بی ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول ۔ سید رضوان حسن سید فرمان حسن یہ دونوں گورنمنٹ سروس میں ہیں ۔

والد مرحوم کے حالات

میرے والد مرحوم کے حالات سے اہل امروہہ بہت کم واقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عمر کا زیادہ حصہ بندیلکھنڈ میں گذرا جہاں ان کی تھوڑی سی زمینداری تھی ۔ وہ سال دو سال بلکہ بعض اوقات تین چار سال بعد امروہہ آتے تھے ۔

وہ ایک زاہد بے ریا اور عابد شب زندہ دار تھے احکام مذہب حقہ کے سختی سے پابند تھے طبیعت چونکہ عزلت پسند تھی ۔ لہٰذا سوسائٹی میں زیادہ گھل مل کر رہنے کے عادی نہ تھے ۔ میں پہلے بتا چکا کہ امروہہ میں کئی صدی سے تعلیم کا چرچا بہت کم تھا ۔ نہ مدارس تھے نہ مکاتیب چونکہ تعلیم نجی طور پر ہوتی تھی اس لئے خالق باری ۔ کریما ۔ مامقیماں اور گلستاں بوستان پڑھے ہوئے اعلےٰ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے ۔ انگریزی کا کوئی ایک حرف نہ جانتا تھا ۔ بلکہ انگریزی تعلیم سے عموماً لوگوں کو سخت نفرت تھی ۔ رہے عربی داں وہ گنتی کے چند لوگ ہوتے تھے ۔

میرے والد مرحوم کی تعلیم بھی گلستاں بوستاں سے آگے نہ بڑھی لیکن

باوجود اس کے کہ وہ کم علم تھے تقویٰ شعاری اور عبادت گذاری میں ان کا پایہ بلند تھا۔ اس خیال سے کہ لوگ یہ نہ کہیں "مرے باپ کی بڑی بڑی آنکھیں ہوتی ہیں:" ان کے حالات بہت اختصار کے ساتھ سپرد قلم کروں گا۔ لیکن ان کے اصلی کردار کو پیش کرنے میں لومۃ لائم کا مطلق خیال نہ کروں گا تاکہ اُن کی پاک روح سے مجھے شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ اس سلسلے میں اتنا اور کہہ دوں کہ مذکورۂ بالا خصوصیات صرف میرے والد مرحوم ہی میں نہ تھیں۔ بلکہ اب سے سو سال پہلے کے بزرگ جس ایمانی ماحول میں اپنی زندگی گزارتے تھے۔ اب وہ خواب میں بھی نظر نہیں آتا۔ اس زمانے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو مذہبی امور میں بڑی دل چسپی سے حصہ لیتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند۔ لقمۂ حلال کے پوری کوشش سے طلب گار۔ دعائیں اور مناجاتیں اور تلاوتِ قرآن کے عادی۔ صلۂ رحم کے خوگر۔ عزیزوں سے ملنے جلنے کے شائق۔

والد مرحوم کو لغو گوئی جھوٹ اور غیبت سے نفرت تھی۔ وہ بڑے محتاط انسان تھے جھوٹے کو بے بھاؤ ڈانٹ دیتے تھے۔ عیش پرستی اور تن آسانی کی طرف طبیعت مائل ہی نہ تھی میں نے جو واقعات ان کی زبان سے سنے ان میں نہ مبالغے کو دخل تھا نہ کذب بیانی کو میں بھی ان کے بیان میں قطعی رنگ آمیزی سے کام نہ لوں گا یہ واقعات اس لئے بیان کرنے ضروری ہیں تاکہ میرے اخلاف حدود انسانیت کو پہچانیں۔

میرے والد کے جوان ہونے سے پہلے اہل امروہہ میں سے اکثر کی زمینداری یا تو ختم ہو گئی تھی یا خاتمہ کے قریب آ گئی تھی۔ جہاں زمینداری ہی سب سے بڑا ذریعہ معاش ہو اس کے حدودِ معیشت کا تنگ سے تنگ تر ہو جانا یقیناً ایسے لوگوں کے ذہنی انتشار اور قلبی اضطراب کا سبب بن سکتا ہے جن کے پاس کسبِ معاش کا کوئی اور ذریعہ ہی نہ ہو۔ امروہہ کے اندر اس وقت ایسے وسائل کا فقدان تھا کہ باعزت طریقے سے زندگی بسر کرنے میں مددگار ہو سکے۔

وقت کی رفتار کو مرحوم نگاہِ اعتبار سے دیکھتے چلے آ رہے تھے اور گردشِ روزگار نے جن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ان کی حالت کے آئینہ میں اپنے مستقبل کا عکس بھی نگاہ کے سامنے تھا۔ ان کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ وطن پرستی کی قربان گاہ میں اپنی ہمت و حوصلے کو بھینٹ چڑھا دیں ؎

سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح
نتواں مرد بسختی کہ من ایں جا زادم

السّفر وسیلۃ الظفر کی حدیث پیشِ نظر تھی۔ ایک مستحکم عزم کے سہارے سفرِ غربت پر آمادہ ہو گئے۔ وطن پرست اہل خاندان نے "گھر کی آدھی اور باہر کی ساری" کہہ کہہ کر ناقابلِ تسخیر ارادے کے پیر میں زنجیر ڈالنی چاہی۔ مگر مستقبل کا ایک روشن منصوبہ باندھنے والے دل نے ان کی خواہشوں کو ٹھکرا کر اپنی راہ لی۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

چرکھاری کا سفر

امروہہ اس زمانے میں ریلوے سٹیشن نہ تھا۔ نہ معلوم کس طریقے سے دہلی تک پہنچے۔ اور وہاں سے

بذریعہ ریل چرکھاری۔ چرکھاری راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جو بجھ
قریب تھی۔ جو آزادی ملنے کے بعد ختم ہو گئی۔
اس سفر کی آخری منزل چرکھاری کو بنانا اس جہت سے تھا کہ والد کے
چچازاد بھائی سید دبیر علی صاحب اس ریاست میں تحصیلدار تھے۔ اُن کا
سہارا لے کر چرکھاری پہنچے حسن اتفاق سے لکھنؤ کے ہاشم علی خاں صاحب (کمبوہ)
اس ریاست کے ناظم تھے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے سید دبیر علی پر ان کی نظر
عنایت تھی۔

ملازمت کا آغاز

دبیر علی صاحب والد کو ساتھ لے کر ناظم صاحب کے پاس پہنچے تعارف کرایا کہ یہ میرے بھائی ہیں تلاش روزگار میں یہاں آئے ہیں یہ سن کر ناظم صاحب کھڑے ہو گئے۔ سینے سے لگایا۔ اور حالات سفر پوچھے (کمبوہ حضرات میں میں نے یہ خصوصیت ہر جگہ پائی کہ وہ سادات کا بڑا احترام کرتے ہیں) اور فرمایا آپ کیا نوکری چاہتے ہیں والد نے کہا کوئی ایسی نوکری جس سے لقمۂ حلال پیٹ میں جائے۔

یہ کلمات ایک نوجوان سے سن کر حیرت سے دیکھا اور اس پاک ارادے کی داد دی اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے پاس رہیں۔ میرے چند گاؤں ریاست اور بیرون ریاست میں ہیں مجھے ان کے لئے ایک محصل کی ضرورت ہے اگر آپ اس کام پر راضی ہوں تو کل سے شروع کر دیجئے۔ پندرہ روپیہ ماہوار آپ کو تنخواہ ملے گی۔ یہ اس زمانے کے پندرہ ہیں جب کہ روپے کا سولہ سیر گیہوں ملتا تھا اور زندگی کی ضروریات پر ارزانی چھائی ہوئی تھی جب کہ

ناظم کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے اور تحصیلدار کی سا ٹھ روپے تھی۔

برادرانہ تعلقات

دنیوی ترقی کے دو ہی میدان ہیں محنت اور جانفشانی سے خدمات کو انجام دینا دوسرے صداقت اور دیانت سے اپنے فرائض ادا کرنا۔ بحمداللہ یہ دونوں خوبیاں والد مرحوم میں موجود تھیں پہلے ہی سال علاقے سے جو رقم وصول کرکے لائے اس نے ہاشم علی خاں کو حیرت میں ڈال دیا کہنے لگے سید صاحب اتنی رقم تو اس سے پہلے میرے پاس کبھی نہیں آئی والد نے فرمایا آپ کے حق پر تصرف غیر نہیں ہوا بس اس کے سوا اور کیا کہوں۔

ہاشم علی خاں مرحوم بڑے مردم شناس اور محنت و دیانت کے قدردان تھے انہیں ایسا دیانت دار تحصیل آج تک نہ ملا تھا جن خدمات کے صلے میں آقا و نوکر تعلق ختم ہو کر اخوت کا صیغہ پڑھ لیا گیا اس کے بعد سے وہ مرتے دم والد کو "بھائی دلشاد علی" کہتے رہے۔ اور برادرانہ بے تکلفی سے ملتے جلتے رہے۔

ہاشم علی خاں پر راجہ کا عتاب

زمانہ اپنے دامن میں مصائب و آلام کے انبار لئے پھرتا ہے۔ اور پلک جھپکتے زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا دیتا ہے۔

بیک ساعت بیک لحظہ بیک دم　　　دگرگوں می شود احوال عالم

وہی ہاشم علی خاں جن کا ریاست بھر میں طوطی بول رہا تھا جن کے در پر صبح سے شام تک اہل کاروں اور اہل حاجت کا تانتا بندھا رہتا تھا ان سے راجہ کسی بات پر جب ناخوش ہو گیا اور معطل کرکے ساری جائداد ضبط کر لی اب اس قابل بھی نہ رہے کہ کوئی سلام بھی کر لیتا۔ واقعات کی رفتار نے چونکا دیا تھا انہوں نے

یہ دانائی کی کہ چند روز پہلے اپنے اہل و عیال کو لکھنؤ بھیج دیا تھا اب وہ اپنے مکان میں نظر بند تھے اور دروازہ پر سپاہیوں کا پہرہ تھا گھر کا تمام سامان قرق ہو گیا والد اس حال سے بے خبر تھے وہ علاقے سے روپیہ لے کر پلٹے تو یہاں یہ حال دیکھا سپاہیوں نے روپیہ چھین لیا اور بمشکل اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر گئے تو اُجڑا ہوا باغ اجڑا پڑا تھا نہ ساز و سامان نہ نوکر چاکر سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

ہاشم علی خاں نے دیکھا تو گلے لگا کر رونے لگے اور کہنے لگے بھائی آپ نے اپنے کو اس آگ کے شعلوں میں کیوں ڈالا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ واپس جائیں میرے پاس رہنا خطرے سے خالی نہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ آپ بھی گرفتار ہو جائیں والد نے فرمایا افسوس ہے کہ آپ نے اب تک مجھے نہیں پہچانا میری رگوں میں سیادت کا خون ہے میں شریف زادہ ہوں کیسے ممکن ہے کہ عیش میں شریک رہوں اور مصیبت میں ساتھ چھوڑ دوں ؎

دوست مشمار آں کہ در نعمت زند — لاف یاری و برادر خواندگی
دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

نظر بندی نے اتنا طول پکڑا کہ جو اثاثہ نظر دشمن سے بچا تھا رفتہ رفتہ وہ سب فروخت ہو گیا۔ کھانا پکانے والی عورت بھی اپنے گھر جا بیٹھی اور زندگی کے لالے پڑ گئے۔ آخری سرمایہ ایک انگوٹھی تھی جسے بیچنے کے لئے والد بازار گئے۔ معتوب راجہ کی انگوٹھی کون خریدتا۔ آخر نگ نکال کر ۲ر میں چاندی بیچی اور آٹا دال خرید کر لائے۔

ہاشم علی خاں اس روز بہت روئے اور بارگاہ باری میں ہاتھ اٹھا کر

کہا اے میرے معبود اب برداشت کی طاقت نہیں۔ بارگاہ ایزدی میں یہ دعا قبول ہوگئی اور ابتلا کا دور خاتمہ پر آگیا۔

تحقیق کے بعد راجہ کو ہاشم علی خاں بے قصور ثابت ہوئے اور ان کی بحالی کے احکام جاری کر دئے گئے۔ خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی۔ اب ہاشم علی خاں پھر وہی ہاشم علی خاں تھے دستر خوانِ نعمت کی بجا گی ہوئی مکھیاں پھر جمع ہونے لگیں۔

والد کی راجہ سے ملاقات

عہدہ پر بحالی کے احکام جاری کرنے کے بعد راجہ نے ہاشم علی خاں کو ملاقات کے لئے بلایا انہوں نے والد سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ والد نے کہا آپ مجھے کیوں لئے جا رہے ہیں مگر بات یہ تھی کہ وہ والد کی وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے موقع ڈھونڈ رہے تھے یہ موقع بہتر نظر آیا۔ زیادہ اصرار کرنے پر ساتھ ہو لئے۔ عند الملاقات کچھ ایسے الفاظ میں والد کی تعریف کی کہ اس نے حاضر کرنے کا حکم دیا والد اندر گئے تو اس نے دیکھا اور ہاشم علی خاں صاحب سے کہا کہ آپ اپنا یہ آدمی ہمیں دید یجئے۔ ہم اس کو تحصیلدار بنادیں گے۔

واپسی پر ہاشم علی خاں نے مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ والد نے فرمایا آپ نے یہ اچھا نہ کیا مجھ سے راجوں مہاراجوں کی نازک مزاجیاں اور ان کے دربار کے آئین برداشت نہ ہوں گے میں ایک فقیر منش آدمی ہوں مجھے عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنے دیجئے۔ یہ تو وہ

لوگ ہیں۔

گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند۔

انہوں نے کہا سید بھائی آپ کیا غضب کر رہے ہیں لوگوں کو ایسے مواقع کہاں ملتے ہیں والد نے چیں بر جبیں ہو کر کہا آپ میری آزادیٔ ضمیر پر دست درازی نہ کیجیئے۔

انہوں نے کہا آپکا انکار راجہ کو گراں گذرے ممکن ہے وہ کوئی غلط کارروائی کر بیٹھے۔ فرمایا میں یہ خطرہ ذہن میں لئے ہوتے ہوں۔ میں ریاست کی حدود میں رہوں گا ہی نہیں۔ انگریزی علاقے میں جو آپ کے گاؤں ہیں ان میں سے کسی ایک میں رہائش کر لوں گا اور وصول شدہ رقم کسی روز پوشیدہ طور سے آکے حوالے جایا کرونگا

زمینداری کا آغاز

جس موضع میں والد مرحوم نے رہنا پسند کیا چھند بھیو نامے تھا جو تحصیل کلپہار ضلع ہمیر پور میں تھا۔ چرکھاری سے ۱۵ میل اور مہوبا سے ۲ میل دور ایک پہاڑ کی گھاٹی میں آباد تھا اس میں تھوڑی سی زمین ہاشم علی خاں سے باداے لگان کاشت کے لئے لے لی اور کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد ملازمت ترک کر کے اسی کو ذریعہ معاش بنا لیا۔

اللہ تعالٰے نے کھیتی میں برکت دی۔ چند سال ہر فصل پر خوب غلہ پیدا ہوا۔ جب ہاشم علی خاں رنجیدہ خاطر ہوئے تو انہوں نے اپنا گاؤں فروخت کر کے لکھنؤ جانا چاہا۔ والد نے اس موضع میں بشرکت ایک ہندو زمیندار کے ایک حصہ

سرکار خرید لیا اب اس موضع میں ان کو زمیندارانہ حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس موضع میں آخر وقت تک ان کی سیر و خود کاشت رہی۔ سرکار سے تقاوی لے کر ایک بند بھی بندھوایا تھا۔ کاشتکاری کا کام نوکر چاکر کرتے تھے جن کی نگرانی ان کا ملازم شیخ احسان کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کو شریک کاشت بھی کر لیا تھا یہ اسی گاؤں کا باشندہ تھا۔

چند سال بعد دو اور گاؤں میں دو آنے اور ایک آنے کے زمیندار بنے دو آنے موضع گورکھا میں تھے اور ایک آنہ موضع بھٹورا میں چونکہ اس موضع کا رقبہ بہت بڑا تھا اس لئے اس کی آمدنی بھی سب سے زیادہ تھی۔

والد مرحوم اول تو امروہہ کے سید تھے پھر تنک مزاج اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اپنی خودداری کو کسی حالت اور کسی قیمت پر ہاتھ سے دینے والے نہ تھے جان جاتے یا رہے اگرچہ زمینداری معمولی تھی مگر وہاں کے بڑے بڑے ہندو زمینداروں پر ایسا رعب چھایا ہوا تھا کسی کو اکڑ کر بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی کتنا ہی بڑا زمیندار ہوتا کیا مجال تھی کہ ان کی چارپائی پر یا ان کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ جب زمیندار ملنے آتے تو جا جم بچھا کر اس پر ان کو بٹھاتے اور خود ایک پیڑھی پر بیٹھ جاتے۔ ہر طرف میر صاحب کہلاتے۔ ہر زمیندار کو قانونی مشورہ دیتے عدالتی معاملات میں ان کی مدد کرتے یہی وجہ ان کی بزرگی تسلیم کرنے کی تھی ورنہ ایک تن تنہا مسلمان زمیندار کو ہندو زمینداروں کے گھیرے میں رہنا ناممکن ہو جاتا۔

وہ اپنے گاؤں کے باشندوں کی ہر ضرورت کے وقت مدد کرتے چونکہ

دغابازی۔ غلط کاری اور خود غرضی سے وہ کوسوں دور تھے اس لئے ان کی بلند کرداری کا نقش ہر دل پر تھا۔

جس گاؤں میں وہ رہتے تھے بہت چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں ۱۵۔۲۰ گھر سے زیادہ نہ تھے صرف دو گھر مسلمانوں کے تھے جن کے رہنے سہنے اور شادی بیاہ کے سب طریقے ہندوانے تھے یہاں تک کہ نام بھی ویسے ہی دستیول۔ سترپاین۔ سمیرا۔ رام کلی۔ شادیوں کی لگن پنڈت بتاتا تیل بچھا کر براتیوں کو کھانا کھلاتا، دلہن بیاہی آتی تو پہلے مندر میں جا کر پرشاد چڑھاتی پنڈت سے ٹیکہ لگواتی گائے کا ذبیحہ ہوتا ہی نہ تھا۔ ہندو کھٹیک دکر قصاب جو بکرا کاٹتے اسی کو مسلمان کھاتے۔

ایسے ناشائستہ اور کفر آغشتہ ماحول میں ایمانی حدود کے اندر رہ کر تقریباً پچاس سال زندگی بسر کی اور پھر اس طرح کہ آن واحد کے لئے اس ماحول سے متاثر نہ ہوئے۔ نہ عمر بھر ان کا ذبیحہ کھایا۔ نہ ذبیحی گھی اور دودھ استعمال کیا۔

نماز کے لئے اذان دیتے تو خلیفہ بلا فصل بڑے زور سے کہتے۔ میں نے کہا اس ویرانے میں آپ اس قدر زور سے کیوں کہتے ہیں۔ فرمایا جہاں تک میری آواز جائے گی ہر بلا سے نجات ملے گی۔ ان کا یہ فرمانا بالکل درست تھا، ان کے گھر میں نہ کبھی چوری ہوئی نہ کسی درندے یا گزندے نے کاٹا نہایت امن و امان سے زندگی بسر کی۔

مغرب وعشا کی نماز سے وہ تقریباً تین گھنٹے میں فارغ ہوتے۔ اس

کے بعد کھانا کھا کر سو جاتے تقریباً ۲ بجے شب کو بلا ناغہ بیدار ہو کر نماز تہجد پڑھتے صبح تک اوراد و وظائف کا سلسلہ جاری رہتا صبح کی نماز کے بعد ایک مناجات بڑے دردناک لہجے میں پڑھتے اور روتے جاتے بعض اوقات ہچکی بندھ جاتی۔

نماز ظہر اول وقت پڑھتے پہلے نوافل پھر نماز ظہر پھر والدین کی قضا نمازیں پھر نوافل پھر نماز عصر۔ یہ عمل دو گھنٹے سے کم نہ ہوتا ایسے کور دیہہ میں جہاں نماز روزہ کا کوئی چرچا ہی نہ ہو ماہ رمضان کے پورے روزے رکھتے کیسی ہی گرمی ہوتی کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آتا ہمیشہ نمک اور گرم پانی سے افطار کرتے۔ نماز مغربین اور وظائف سے فارغ ہو کر کھانا کھاتے۔ سحری انہوں نے کبھی کھائی ہی نہیں ان کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ خواہ گاؤں میں ہوں یا امروہہ میں۔

زہد وہ زینت و آرائش دنیوی سے سخت متنفر تھے۔ سیدھی سادی زندگی کے دلدادہ تھے جس گھر میں وہ بہ حیثیت زمیندار کے رہتے تھے وہ رعایا کے تمام گھروں سے زیادہ پست تھا، کچے در و دیوار ہر حصے پر کھپریل، جو کھپریل ہٹ گیا وہ ہٹ گیا سوائے چند چارپائیوں اور ایک پیڑھی کے کوئی سامان گھر میں نہ تھا دیہاتی ساخت کا ایک تخت تھا اسی پر نماز پڑھتے تھے اتنے ہی حصے کے کھپرے ٹھیک تھے۔ باورچی خانے میں دری یا کمبل بچھا کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانا کھا کر دیر تک ہاتھ اٹھائے ہوئے بارگاہ باری میں شکر ادا کرتے۔ بدن گدا طاقتور تھا اور صحت بھی اچھی تھی جو گاؤں کی آب و ہوا کی برکت تھی۔

لباس میں کبھی ڈھیلے پائنچہ کا مولویانہ پاجامہ پہنتے تھے کبھی تنگ موری کا پرانے فیشن کا انگرکھا سر پر پگڑی یا دوپلی ٹوپی۔ مقدمے کے سلسلے میں جب باہر جاتے تو پگڑی ضرور باندھتے۔ اپنے بستر پر کسی کو بیٹھنے نہ دیتے۔ سو کر اٹھتے تو فوراً لپیٹ دیتے۔

میرے ایک عزیز نے گھر کی تباہ حالی دیکھ کر کہا یہ تو بہت ہی خستہ ہے۔ کم سے کم ایک کمرہ تو پختہ بنوا دیجئے۔ فرمایا جس گھر میں اَبدی نیند سونے والا ہوں کیا اس کی آرائش اور پختگی کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔ مجھے قبر میں جانا ہے اس گھر میں ہمیشہ نہیں رہنا۔

طہارت کافروں کے ماحول میں پچاس سال کی طویل مدت اِس طرح گذار دینا کہ ایک قطرۂ نجس پیٹ میں نہ جائے اور کافرانہ رسوم میں کسی طرح کی شرکت نہ ہو پاکیزگی باطن کی بیّن دلیل ہے۔ ہندوؤں کا کیا ذکر وہ تو وہاں کے غیر محتاط مسلمانوں کے یہاں کا گھی اور دودھ بھی استعمال نہ کرتے تھے اگر یہ چیزیں گھر کے مویشیوں سے مل گئیں تو کھا لیں ورنہ ہفتوں بے گھی دال پر بسر کی۔ گوشت کو دل چاہا تو مرغی یا بکری ذبح کر لی۔ مرغی ۳؍ میں ملتی تھی۔ اچھے بکرے کی قیمت دو روپیہ تھی۔ اپنے باورچی کو جو بلگرام کے شیعہ تھے۔ اور جو تقریباً ۵۰ سال ان کی خدمت میں رہے اور مر کر ہی اس گھر سے نکلے۔ تمام آدابِ طہارت تعلیم کر دئے تھے۔ والد کے انتقال سے تین سال بعد تک زندہ رہے۔

موضع چھدیو جس میں والد مرحوم کا قیام تھا اس میں ۱۲ کے شریک سے ایک پسٹور برہمن پا پرسرام جی تھے بارہ گاؤں کے مالک تھے۔ شریک زمینداری ہونے کی وجہ سے ان سے ربط ضبط رکھنا ضروری تھا ہفتہ میں ایک دو بار ان کے گاؤں بھشورہ نامے جانا ضروری ہوتا لیکن نہ ان کے فرش پر کبھی بیٹھے نہ چارپائی پر اور نہ ان کی کوئی تر چیز کھائی۔ ایک پیڑھی اپنے لئے بنوا کر رکھوا دی تھی اسی پر بیٹھتے۔ یہ ایک کمرے کی چھت میں لٹکی رہتی اسی کے ساتھ ایک ٹین کا لوٹا اور ڈور لٹکا رہتا۔ اگر پیاس لگتی تو گاؤں سے کسی مسلمان کو بلواتے کہ وہ کنوئیں سے پانی لے آئے مگر اس سے یہ کہہ دیا جاتا کہ لوٹے کو ہاتھ نہ لگائے اوپر سے ڈور پکڑے ہوئے لائے پسٹور جی ملنے آتے تو ایک دری پر ان کو بٹھاتے اور جب چلے جاتے تو تہہ کرا کے رکھوا دیتے خود اس پر کبھی نہ بیٹھتے۔ زمیندار کے یہاں کسی تقریب میں جاتے تو نوکر ایک لنگی ساتھ لے جاتا۔ فرش پر اسے بچھا کر بیٹھتے واپس آتے تو اسے دھو کر پھیلا دیتے۔ اطراف وجوانب کے تمام زمیندار ان کی اس احتیاط سے واقف تھے مگر ان کا برتاؤ چونکہ ہمدردانہ تھا اس لئے کسی کو برا نہ معلوم ہوتا تھا۔

باوجود اس شدید مذہبی تعصب کے پسٹور جی اور ان کا تمام خاندان بڑی عزت کرتا اور اپنا بزرگ سمجھتا تھا جب وہاں جاتے تو چھوٹے بڑے سب سرو قد تعظیم کو کھڑے ہو جاتے اور ہر طرف سے آواز آتی میر صاحب سلام۔ میر صاحب سلام۔

پسٹور جی کو ان سے ایسی محبت تھی جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے وہ والد

کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے والد کو اپنا مختار عام بنا دیا تھا جب مقدمے کے سلسلے میں باہر جاتے تو واپسی پر کوڑی کوڑی کا حساب سمجھا دیتے ایک بار چند آنے بچے تھے جب انہیں دینے لگے تو پستور جی نے کہا اگر یہ آپ ہی کے پاس رہ جاتے تو کون بڑی بات تھی میں تو آپ سے کبھی حساب نہیں مانگتا یہ سنتے ہی غصہ آگیا اور کہنے لگے اگر آپ نہیں لیتے تو میرا لینے والا تو حساب لے گا۔ کیا آپ میرے اندر چوری کی عادت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شرمندہ ہو کر معافی مانگنے لگے یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔

اس اسلامی کردار اور ایمانی سرگرمی نے وہاں کی ہندو پبلک پر بڑا اثر ڈالا۔ وہ کہا کرتے تھے میر صاحب تو دیوتا ہیں میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ پستور جی کہا کرتے تھے مجھے تو اسلام بہت پسند ہے خدا پرستی تو مسلمانوں میں ہے ہم تو پتھروں کے پجاری ہیں۔

کبھی والد سے ملنے آتے اور باورچی خانے سے گوشت پکنے کی خوشبو آتی تو کہتے پیر بخش (باورچی کا نام) آج تو کوئی بڑا مزہ دار کھانا پک رہا ہے۔ وہ کہتے پستور جی وہی مسلمانوں کا کھانا ہے۔ ہنس کر کہتے جی تو چاہتا ہے کھاؤں۔ مگر ان بدمعاش ہندوؤں سے ڈرتا ہوں ذات سے نکال دیں گے۔

پستور جی کو والد سے شدید محبت تھی جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو والد امروہہ میں تھے مرتے دم وہ یہی کہتے رہے تار دو میر صاحب کو بلاؤ۔

خودداری

والد مرحوم بڑے خوددار تھے وہ زیادہ نہ بولتے تھے اور نہ لغو گفتگو کو پسند کرتے تھے۔ حفظ مراتب کا بڑا لحاظ رکھتے

مراتب کا بڑا لحاظ رکھتا تھا اور اپنی شان میں کسی کی گستاخی پسند کرتے تھے۔

ضلع ہمیرپور ایک کلکٹر نہایت بدزبان اور سخت مزاج آ گیا۔ وہ زمیندار سے بغیر ڈیم فول کہے بات ہی نہ کرتا تھا جس زمیندار سے ناخوش ہوتا اسے ہنٹر سے مارتا بھی۔ زمیندار اس سے بہت خائف رہتے تھے وہ اپنے دورہ میں جس گاؤں میں جاتا بڑا متشددانہ رویہ اختیار کرتا۔

اس کی بدمزاجی کے افسانے والد سُن چکے تھے انہوں نے اپنے نوکر شیخ اصالت سے کہا جو بڑا جیالا آدمی تھا کہ اگر یہ حرام زادہ ہمارے گاؤں میں آئے اور مجھ سے بدکلامی کرے تو تلوار مارنا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ایک روز وہ آ گیا گھوڑے پر چپراسی کے ہاتھ میں ہنٹر والد اور اصالت اس کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ تھے۔ اپنی عادت کے مطابق اس نے ڈیم فول کہہ دیا بس پھر کیا تھا۔ سیادت کے بدن میں خون کھول گیا۔ چپراسی سے کوڑا چھین کر مارا تو گھوڑے کے پٹھے پر پڑا اور اصالت سے للکار کر کہا دیکھتا کیا ہے مار حرام زادے کے تلوار وہ تلوار سونت کر لپکا اور صاحب بہادر حواس باختہ ہو کر بھاگے۔

تین میل دور کلپہاڑ کا تھانہ تھا وہاں رپٹ درج کرائی فوراً پولیس کا ایک مسلح دستہ روانہ ہوا۔ اور والد اور اصالت کو گرفتار کر کے لے گیا پھر ضمانت پر چھڑا لیا۔ اب مقدمہ چلا۔ چونکہ کلکٹر مد مقابل تھا۔ لہذا ماتحت عدالتوں سے ہارتے چلے گئے۔ آخر ہائی کورٹ میں اپیل ہوا مولوی سید کرامت حسین صاحب نے جو اس وقت ہائی کورٹ کے نامور بیرسٹروں میں تھے

اور بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہوئے پیروی کرکے کامیابی حاصل کی۔ اِس مقدمہ میں کثیر رقم خرچ ہوئی جس سے ایک گورکھا گاؤں کی زمینداری بھی ختم ہوئی اور کئی ہزار روپے کے مقروض ہو گئے۔

سخاوت اور رحم دلی

والد مرحوم کسی کی پریشانی دیکھ ہی نہ سکتے تھے اور ہر وقت جو امداد ممکن ہوتی ضرور کرتے چاہے ان کو کیسی ہی تکلیف ہوتی۔ گاؤں کے کاشتکار جب اپنی تہی دستی بیان کرتے تو ان کا لگان معاف کر دیتے۔ رستم خاں امروہہ میں ہمارے ہمسایہ تھے۔ سنی سے شیعہ ہو گئے تھے۔ والد جب امروہہ آتے تو ان کی مدد ضرور کرتے ایک بار والد واپس جانے والے تھے اور بقدر کرایہ ان کے پاس رقم تھی رستم خاں بیمار پڑ گئے۔ اور علاج کے لئے ان کے پاس پیسہ نہ تھا۔ کرایہ کی سب رقم ان کو دیدی۔ غیرت نے کسی عزیز سے قرض لینا گوارا نہ کیا۔ بڑی لڑکی کا کچھ زیور فروخت کر کے تشریف لے گئے۔ ایسے اور بھی واقعات ہیں جن کو بغرض طوالت ترک کرتا ہوں۔

صلۂ رحم

جب امروہہ آتے تو ایک ایک رشتہ دار سے چاہے کتنی ہی دور کا ہو۔ اس کے گھر جا کر بڑے تپاک سے ملتے اور اگر کسی پریشان پاتے تو مدد کرتے۔

احسان شناسی

ہاشم علی خاں جن کا ذکر پہلے ہو چکا لکھنؤ میں سخت بیمار ہوئے والد ان کی عیادت کے لئے اپنے نوکر شیخ احسانات کے ساتھ لکھنؤ گئے ان کی حالت سقیم ہو چکی تھی کسی عامل نے بتایا

بتایا کہ اگر گومتی دریا کے اندر دو صدقے اس قسم کے رکھے جائیں تو ان کی شفا ہو جائے گی لیکن صدقے جانے والوں کی جان کا خطرہ ہے۔ اگر وہ مر جائینگے تو یہ بچ جائینگے اور اگر وہ بچ کر آگئے تو یہ مر جائیں گے نصف شب کے بعد صدقہ کی تھالی سر پر رکھ کر جانا ہوگا اور مختلف جگہوں پر کمر کمر پانی میں جا کر رکھنا ہوگا چونکہ جان جوکھوں کا معاملہ تھا کوئی صدقے جانے پر تیار نہ تھا ان کے صاحبزادے مرتضے حسین خاں نے پانچ پانچ سو روپیہ دیا مگر اتنی سستی جان کس کی تھی کوئی تیار نہ ہوا۔

والد نے گھر والوں کو پریشان دیکھ کر پوچھا کیا معاملہ ہے انہوں نے خطرے کو چھپا کر صرف صدقہ کا ذکر کر دیا والد نے ہاشم علی خاں کے احسانات کو پیش نظر رکھ کر کہلا بھیجا کہ وہ صدقہ کہاں ہے میں اور میرا نوکر لئے جاتے ہیں چنانچہ دونوں صدقے کر روانہ ہوئے۔ ایک شخص رہنمائی کے لئے لیمپ لے کر ساتھ ہوا جب گومتی قریب آئی تو لیمپ والا رک گیا اور یہ دونوں آگے بڑھے اور الگ الگ بتائے ہوئے مقام کی طرف چلے والد فرماتے تھے جب میں کمر کمر پانی میں پہنچا اور صدقہ سر سے اتار کر پانی پر رکھا ایک مہیب صورت برہنہ بدن عورت اس پر آکر جھک گئی اور پانی میں ایسا شور ہوا کہ خدا کی پناہ۔ میں باہر نکلنے کے لئے پاؤں ڈالتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا میں نادِ علی کا ورد کرتا ہوا بمشکل تمام پانی سے نکلا اور اس جگہ آیا جہاں لیمپ والا کھڑا تھا اصالت کو پانی میں تو کچھ نظر نہ آیا لیکن جب باہر نکلا تو سر حرکت کٹے ہوئے سر اور ہاتھ تڑپتے نظر آئے آدمی دلیر تھا ان سب کو روندتا ہوا چلا گیا جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو گھر میں سے رونے کی آواز آئی معلوم ہوا ابھی دم ٹوٹا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرا عہدِ طفلی

سایہ کا ڈھلکاؤ اور دریا کا بہاؤ کس کی طاقت کہ روک دے وقت بڑی نیرنگیوں کے ساتھ اڑا چلا جاتا ہے اگر دولت ایک ہی مٹھی میں بند رہتی تو انسانی تمدن میں خاک اڑتی اور در و دیوار سے رونے پیٹنے کی آواز آتی اور معاشرہ میں فلاکت و نحوست کے بھوت چھلانگیں مارتے۔ نظامِ قدرت یہی ہے کہ خزاں کے بعد بہار اور بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ کبھی دن کا اجالا ہو کبھی رات کی تاریکی۔ جو آج مسند نشین ہے کل وہ بوریئے کا محتاج ہے۔ آج کا خاک نشین کل کا تاجدار ہے۔ آغاز آفرینش سے دنیا کا یہی رنگ ہے اور قیامت تک یہی رہے گا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میری پیدائش سے پچاس قبل میرے خاندان کا موروثی اقتدار موت کی ہچکیاں لے رہا تھا جو زمینداری رہ گئی تھی وہ کانٹے پر کی اوس یا اژدر پر سفیدی کی برابر تھی۔ بزرگوں میں تقسیم ہوتے ہوتے میرے دادا تک جو کچھ پہنچی وہ محض بزرگوں کا تبرک تھا۔ میرے والد صاحب تک پہنچتے پہنچتے وہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن گیا تھا۔ اور کل زمیندار آج کے چاکر تھے۔

ہاں نسبی سعادت کا ہما ضرور سر پر سایہ فگن تھا پدرم سلطان بود کہہ کر دل میں تھوڑی سی گدگدی تو ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر باتوں سے پیٹ بھرتا تو پھر کسب معاش کے لئے دوڑ دھوپ ہی کیوں رہتی۔

تایا صاحب نابینا تھے گاؤں سے جو کچھ تھوڑا سا دانہ دُنکا آجاتا اسی پر صبر کر لیتے مگر اس قناعت کی چادر میں پیر پھیلانے کی گنجائش کہاں تھی والد صاحب نے ہوش سنبھالا تو اسی معاشی بدحالی کے تنگ دائرے سے جلد نکل جانے کی کوشش کی جس کا ذکر پہلے ہو چکا میری ولادت موضع چھدیو تحصیل کلپہار ضلع ہمیر پور میں ہوئی چار برس کا تھا کہ والدہ وطن آگئیں میں نے جس جہالت آگین اور وحشت ناک فضا میں ہوش سنبھالا اس کا ذکر کرتے شرم آتی ہے جہالت کی گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور زندگی کے میدان میں گھپ اندھیرا تھا سادات عظام کی اولاد اپنے شریفانہ اطوار کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا چکی تھی حالی مرحوم کے مسدس کا یہ بند ان پر صادق آتا تھا۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

مدک اور افیوں کا رسیا ہے کوئی
چرس اور گانجے کا دھتیا ہے کوئی

بلوا النقشہ مسدس میں ہے۔ میرا قلم اس سے زیادہ لکھتے شرماتا ہے۔

اگرچہ یہ وبا عام تھی مگر میرے محلے کی فضا میں یہ زہر زیادہ گھلا ہوا تھا۔ ناممکن تھا کہ مہلک ماحول میں سانس لینے والا اپنے خاندانی وقار اور سیادت کی شرافت کو برقرار رکھ سکتا۔

لڑکے تعلیم سے دور۔ جوان مشاغل لاعینی میں مست اور بزرگ پدرم سلطان بود" کے نشہ میں سرشار۔ تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اس چھوٹی سی مکتب پر تھی جس میں ایک خلیفہ جی معمولی لکھے پڑھے طریقہ تعلیم سے ناآشنا سرمایہ نفیس پر تعلیم دیتے تھے اور غلط سلط جو چاہتے پڑھاتے اس زمانہ میں جس نے خالق باری (کتاب کا نام) کریما اور ماقیماں (کتابوں کے نام) پڑھ لیا اس کی پوزیشن اس زمانے کے گریجویٹ کی سی تھی اور اگر گلستاں بوستاں اور بہار دانش یا انوار سہیلی پڑھ لی تو کالجوں کے پروفیسروں کا منہ مارتے تھے۔

باپ اپنے بیٹے کو یہ کہہ کر خلیفہ جی کے حوالے کرتا تھا کہ گوشت آپ کا اور ہڈی ہماری یعنی جتنا چاہیے ماریئے اس کا سارا بدن آپ کے حوالے ہے اب اس اقتدار اعلیٰ کے ہاتھوں غریب بچوں کی جو گت بنتی اس زمانے کے طلبا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے قمچیوں کی مار۔ لات گھونسے۔ تڑاتڑ طمانچے۔ گوشمالی۔ ہاتھوں اور گھٹنوں پر ٹھیکریاں رکھوانا مرغا بننا۔ ملا جی مکتب میں سو جائیں تو پنکھا جھلنا۔ اگر ان کے یہاں گائے بھینس ہے تو اس کو ٹھانا۔ بازار سے سودا سلف لانا۔ یہ بے تنخواہ کی نوکری۔ علم حاصل کرنے کا تاوان۔ یا استاد جبراً ان کی اہلیت و قابلیت کے مسند رکھ پر شاد تھا۔ کسی لڑکے کی مجال نہ تھی کہ اف کر سکے یہ تھا اس زمانہ کا طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم۔

اوقات مکتب کے بعد میرے ہم سن سید زادوں کے محبوب مشغلے تھے تاش۔ چوسر کبڈی۔ گلی ڈنڈا۔ پتنگ بازی۔ کبوتر بازی اور اسی قسم کے لاعینی کھیل۔ تماشے۔ ان گھڑ دوڑ دن میں سستے جلتے تو تماشائی تعریف کر کے دل بڑھاتے ایسی صورت میں پڑھنے لکھنے کو دل کس کا چاہتا اردو کی دو چار کتابیں پڑھ لینا کافی تھا۔

اگر کوئی بد قسمت اس مقدس دائرہ سے باہر ہوتا تو اس کی نا اہلی پر ہر طرف سے تیر ملامت کی بوچھار ہوتی اور وہ اس مہذب بزم میں بیٹھنے کے قابل نہ سمجھا جاتا۔

خیال کیجئے اس ناستودہ دَور میں انسانی تہذیب کو کیسی دیمک لگ گئی تھی اور فضیلت کا معیار کتنا پست ہو گیا تھا۔ ایک حمام میں جب سب ننگے ہوں تو بُرا کون کہے۔

آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایسے گندے اور ہمت شکن ماحول میں کسی نوجوان کو اپنے مستقبل کے لئے کوئی کامیاب ماحول بنانا اور اس دہشت ناک حلقے سے باہر نکل کھڑا ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مناسب ذرایع کا فقدان۔ ہمت افزا ماحول سے کوسوں دور۔ سوسائٹی کا غیر معمولی دباؤ ارادے کے پیر میں فولادی زنجیریں تھیں۔

میں تقریباً ۱۸ سال تک اس ضلالت آگیں طلسمات میں محصور رہا۔ لکھنا پڑھنا برائے نام۔ کھیل کود زیادہ۔ وقت تھا کہ پانی کی طرح تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر غفلت و فراموشی کے گہرے پردے جو دل و دماغ پر پڑے ہوئے تھے ماحول کے رنگ میں رچی ہوئی طبیعت ان کو ہٹانا گوارا ہی نہ کرتی تھی۔ یہ زہر کے پیالے غٹ غٹ حلق سے اترتے تھے مگر مفلوج ذہنیت ہوئے سے بھی نہ ٹوکتی تھی۔ بگڑی بات بناتا کون۔ باپ یوں دور۔ ماں تعلیمی فوائد سے نا آشنا۔

اس زمانہ میں ماؤں کی قابلیت اس مرکز پر تھی کہ بچوں کو پال پوس کر شباب کی منزل تک پہنچا دیں اور جلد از جلد شادی کر کے پوتے یا پوتی کی دادی بن جائیں۔

ان کا نظریہ یہ تھا کہ شباب ہر قسم کی اہلیت کو خود کھینچ لاتا ہے اس وبائے عام کی

مریضہ میری والدہ مرحومہ بھی تھیں۔

کیا میں اپنی عمر کے اس ناکارہ حصہ کو اپنی زندگی کی منزلوں سے خارج کردوں کیا اپنی اس شرمناک حالت پر پردہ ڈال کر آگے بڑھ جاؤں؟ نہیں نہیں میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ مجھے یہ وقت بھی عزیز ہے کیوں کہ یہ ایک متاع گرانمایہ کا امانت دار تھا۔ اس کے گرد آلود دامن میں بہت سے چمکدار موتی بھی تھے اس نے مجھے چونکایا اس نے بھیانک مستقبل سے مجھے ڈرایا اس نے ذلت کی زندگی بسر کرنے سے مجھے بچایا یہ ایک آئینہ تھا جس میں میں نے اپنے مستقبل کو تاریک دیکھا۔

میں اپنے معبود برحق کا کس زباں سے شکر ادا کروں کہ اس نے اپنی رحمت کا پھیلا ہوا رُخ میری طرف موڑا۔ یکایک میری طبیعت کو کُھٹا دیا اور اسے شیطانی ماحول سے نکال کر ایک نورانی فضا میں لے آیا۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

کیا ہوا اور کیونکر ہوا اس کو میں نہیں جانتا صرف اتنا معلوم ہے کہ رحمت کے فرشتے نے میرے کان میں چپکے سے کہا "اس ذلیل زندگی سے مرجانا بہتر ہے شریفوں کی اولاد ایسی نہیں ہوتی۔ دیکھو سنبھلو۔ ہوش میں آؤ۔ کام کا وقت ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔"

یہ میری زندگی کا وہ مقدس و مبارک دن تھا جس نے مجھے سب کچھ بنا دیا۔ عالم دین بنایا، ادیب بنایا۔ محقق بنایا شاعر بنایا مصنف بنایا۔ مذہب کا خدمت گزار بنایا طبیعت کا رُخ پلٹتے ہی کچھ بننے کی فکر ہوئی۔

شیطانی ٹولے کے وہ ممبر جن کے ساتھ لہو و لعب میں زندگی کے چند سال گزارے تھے میرے ارادے سے واقف ہوتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ خفیہ رکاوٹیں ان کے

امکان میں قمیص لا کھڑی کیں طعن زنی بھی کی، زدو کوب بھی کھایا، ناصحانہ انداز میں سمجھایا بھی۔ کتابیں چھین چھین کر پھاڑیں اور کنوئیں میں ڈالیں بھی۔ دامن پکڑ کر کھڑے بھی ہوئے مگر یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دے میرا جواب صرف یہ ہی تھا سہ

میازار دل راکہ ایں مرغ وحشی
زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

بحمد اللہ میرے مستحکم ارادے نے سرراہ کی سب چٹانوں کو ہٹادیا اگرچہ مجھے کافی تکلیف اٹھانا پڑی۔ یاران طریقت نے میرا مکمل بائی کاٹ کردیا جدھر سے میں نکلتا آوازے کستے ہٹ جاؤ مولانا صاحب آرہے ہیں۔ یہ میرے لئے نیک فال تھی۔

میری پہلی درس گاہ

میرے محلے کے قریب محلہ چہیڑہ میں سید نظام حسن صاحب کے مکان میں ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جس میں دو تین مدرس پڑھاتے تھے صدر مدرس منشی سید مبارک حسن صاحب تھے جو فارسی کتابیں خوب پڑھاتے تھے سال ڈیڑھ سال یہاں اردو فارسی پڑھی۔ گلستاں بوستاں اور انوار سہیلی کے کچھ حصے یہاں پڑھے۔ جب یہ مدرسہ منتقل ہو کر مسجد شفاعت پوتہ کے زیر پا کمروں میں گیا تب بھی میں اسی مدرسہ میں جس کا نام سید المدارس رکھا گیا تھا تعلیم پاتا رہا اس عرصے میں اردو فارسی میں خاصی شد بد ہوگئی مگر عربی تعلیم بہت کم رہی۔

میری دوسری درس گاہ

اسی زمانہ میں محلہ بجگہ کے امام باڑہ میں روسا محلہ کی عالی ہمتی سے چھٹے درجہ تک ایک انگریزی اسکول امام المدارس کے نام سے کھولا گیا جو بعد میں مڈل اسکول پھر ہائی اسکول اور اب بحمداللہ انٹر سائنس کالج ہے۔

میں نے یہاں داخلہ لے کر دو سال تعلیم حاصل کی لیکن بجائے انگریزی کے عربی زبان کا نصاب اختیار کیا مع دیگر مضامین کے۔ عربی کی ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں یہیں پڑھیں منشی مسیح اللہ صاحب جو سنی سے شیعہ ہوئے تھے عربی کے مدرس تھے علم الصیغہ میں نے ان ہی سے پڑھا۔ میرے کلاس فیلو سید سبطین احمد صاحب تھے جو اب کراچی میں میرے مکان کے قریب ہی رہتے ہیں اور وہ وقت مجھے یاد دلایا کرتے ہیں منشی مسیح اللہ صاحب کے مرنے کے بعد مولوی اجمل حسین صاحب امروہوی ان کی جگہ پر مقرر ہوئے ان سے میں نے شرح مائۃ عامل پڑھی۔

غیب کے پردوں میں کس نے جھانک کر دیکھا تھا کہ آج میں جس مدرسہ کا طالب علم ہوں کل اس کی کمیٹی کا ممبر ہوں گا اور اس کے اسکول بنانے میں میری کوششوں کو بھی دخل ہو گا۔

میرے والد مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ میں مولوی بنوں جب شادی کے سات سال بعد تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور پھر ہوئی تو لڑکی تب خدا سے دعا کی کہ اگر میرے لڑکا پیدا ہوگا تو میں اسے مولوی بناؤں گا چنانچہ اسی سال میں پیدا ہوا فرمایا کرتے تھے تم میری دعا کا اثر ہو۔

میری تیسری درس گاہ

چونکہ امام المدارس میں عربی تعلیم زیادہ نہ تھی اس لئے مجھے پھر اپنی سابق مدرسہ کے سید المدارس میں آنا پڑا اب اس مدرسہ کی جدید عمارت جامع مسجد کے قریب بن چکی تھی اور اعلیٰ مذہبی تعلیم کا بندوبست تھا میں نے کئی سال اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی جب میں نے داخلہ لیا اس وقت صدر مدرس جناب مولانا اولاد حسن صاحب قبلہ تھے اور مدرس دوم جناب مولوی سید طالب حسین شاہ صاحب چکڑالوی [illegible] جو سنی سے شیعہ ہوئے تھے منطق و فلسفہ پڑھاتے تھے۔

مولانا طالب حسین صاحب قبلہ ادب عربی کے اچھے ماہر تھے چنانچہ ہمارے درجہ کا ادب اور صرف و نحو ان ہی سے متعلق تھی نہایت پاکیزہ سیرت اور خاموش طبیعت عالم تھے پنجابی وضع میں رہتے تھے سر پر پٹے پنجابی کرتا اور پنجابی طرز کی لنگی دو سال ہمیں مولانا سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ میرے پاکستان آنے کے بعد کئی سال تک زندہ رہے مگر افسوس ہے کہ شرف قدم بوسی حاصل نہ ہو سکا۔

اسی زمانہ میں مولانا اولاد حسن صاحب قبلہ سے شرائع الاسلام پڑھنے کا موقع ملا چاہتا ہوں تھوڑے سے حالات اس فرشتہ خصلت عالم کے بیان کروں۔

مولانا اولاد حسن قبلہ کے مختصر حالات

مولانا مرحوم اس خانوادۂ علم و فضل کی ایک فرد تھے جس میں عرصے سے عالم دین ہوتے چلے آرہے تھے جامع مسجد کی پیش نمازی اور مذہبی قیادت اسی خاندان سے مخصوص تھی دل تو چاہتا ہے اس صاحب کمال کے ایک ایک بات کی تعریف کروں مگر ان

اوراق میں اتنی گنجائش نہیں۔ مولانا مرحوم بہت سادہ لباس پہنتے تھے۔ سر پر دوپلی بد قطع سی ٹوپی لٹھے کا بنیان کرتا لٹھے کا چوڑے پائنچہ کا پاجامہ۔ اسی سادے لباس میں بڑے سے بڑے جلسے میں چلے جاتے تو ان کی تعظیم میں کوئی فرق نہ آتا۔

البتہ جمعہ اور عیدین کو موروثی جبہ پہنتے۔ عمامہ باندھتے۔ مگر نہ ایسا شاندار جیسا کہ اس زمانے کے علماء باندھتے ہیں بلکہ پیچ پر پیچ اور لپیٹ پر لپیٹ ہوتا ہر پنجشنبہ کو سر منڈواتے داڑھی کو خضاب کراتے داڑھی بڑی گھنی اور شاندار تھی۔

مولانا ہر ادنے و اعلےٰ سے بڑی بے تکلفی سے ملتے محلہ شفاعت پوتہ کے خانقاہ میں ایک چھوٹا سا حجرہ تھا جس میں بوریے کا فرش تھا۔ یہی مولانا کی نشست گاہ تھا جو لوگ ملنے کو آتے تو اسی حجرے میں بیٹھتے۔ امیر و غریب سب یکساں تھے۔ اس سادگی اور تواضع پسندی نے ان کے اعزاز کو ایک سے ہزار بنا دیا تھا امروہہ میں ان سے زیادہ کسی عالم کی عزت نہیں ہوئی۔ سنی اور ہندو تک ان کا احترام مدنظر رکھتے تھے۔

علم فقہ میں میراث کے مسائل پر ان کو بڑا عبور تھا علمائے اسلام میں پہلے وہی شخص تھے جنہوں نے مسائل میراث کو نظم کیا افسوس ہے کہ مجھے ان سے کتاب المیراث پڑھنے کا موقعہ نہ ملا اور یہ کمی آج تک دور نہ ہوئی۔

مولانا مرحوم اثنائے درس میں لطیفہ پر لطیفہ سناتے رہتے تھے۔ عربی فارسی اور اردو اشعار بھی موقع موقع کے لحاظ سے بیان فرماتے تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتے مولانا بڑے متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ مجھے تقریباً تین سال ان کی مقدس شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ میں نے کہیں اس میں جھول نہ پایا۔

وہ نہ کسی کی برائی کرتے تھے اور نہ سنتے تھے۔ غیبت، حسد اور خودستائی سے وہ کوسوں دور تھے۔ خوشامد کسی کی کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ریا، غرور اور مکر سے ان کو سخت نفرت تھی۔

اول تو ان کے مخالف بہت کم لوگ تھے اور کسی کو ان سے للّٰہی بغض ہو جاتا تو وہ کبھی اس کو ناسزا الفاظ سے یاد نہ کرتے۔ ایک بزرگ سے ان کو کچھ شکایت پیدا ہوئی میں نے مخالفت کا سبب پوچھا دوسرا ہوتا تو پھٹ پڑتا اور غصے میں خدا جانے کیا کیا کہہ جاتا مگر دیکھیے انہوں نے صنعت مراعاۃ النظیر کا استعمال کر کے شکوہ کو کس طرح بنا دیا فرمایا۔ وہ میرے مخالف ہیں کبھی کبھی الجھ جاتے ہیں اور ہر معاملے میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چاہتے ہیں میں ان کے شاد نہ شانہ بیٹھوں اور ان کی ہر مانگ پوری کروں اور چوٹی کی بات یہ ہے کہ فرق مراتب بھی نہ رہے۔ وہ کتنے ہی بل کھائیں میرا بال بیکا نہیں کر سکتے! مسکرا مسکرا کر یہ پُر لطف جملے ادا کرتے رہے۔

مولانا کو شاعری میں بڑا کمال حاصل تھا تسلیم تخلص فرماتے تھے۔ امروہہ کے تمام نامور شیعہ شعراء ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے اور وہ اس کام سے اکتاتے نہ تھے۔ فن عروض و معانی و بیان میں ان کو بڑا دخل تھا۔ شعر میں جو عیب ہوتا اسے فوراً پکڑ لیتے اور بہت جلد مناسب اصلاح فرما دیتے۔

ایک بار میں نے ایک سلام اصلاح کے لئے پیش کیا ردیف قافیہ تھا۔ آب پانی میں۔ حساب پانی میں۔ جب اصلاح ہو چکی تو میں نے کہا حضور کباب پانی میں بیچ میں سے رہ گیا۔ ذرا دیر تامل کے بعد فرمایا یوں لکھ دیجیے:

لپٹ کر ذوالفقار شعلہ افشاں
کہ شامی تھی یوں کرتے تھے ہو کر کباب پانی میں

مرثیہ

بسلسلۂ وفات حسرت آیات جناب مولانا سید اولاد حسن صاحب قبلہ مرحوم و مغفور

کیا سناؤں داستانِ حسرت و رنج و محن　　وقت تھوڑا طبع محزوں اور طولانی سخن
ترکِ چرخِ سفلہ جو کا ایسا بگڑا ہے چلن　　سامنے جاتا ہے جگر پہ ناوکِ خارا شکن

مندمل زخمِ کہن ہونے پہ آتا ہے اگر
ٹانکتے ہیں داغِ تازہ دامنِ قلب و جگر

سرد عیشِ دنیوی سے ہو گیا قلبِ حزیں　　اس نمودِ بے بقا میں نام کو لذت نہیں
چاشنی جس میں نہاں ہے اس کی زہر آگیں　　نوش گیا از نیش ہو گر زہرِ ہلاہل انگبیں

کیف سے خالی یہ جامِ خوش نمائے دہر ہے
ابتدا اس کی بُری انجام اس کا زہر ہے

ایک دھوکا ہے کھلا فصلِ بہارِ زندگی　　جوں سرابِ تشنہ کش ہے چشمہ سارِ زندگی
داغدار ہی ہے لالہ زارِ زندگی　　موردِ رنج و بلا ہے ارضِ دارِ زندگی

اک تماشہ یہ حبابِ ہستیٔ موہوم ہے
بود جس کا نام ہے اس کی بقا معدوم ہے

ساری دنیا پر اگر حاصل ہو قدرت ہیچ ہے　　تخت و تاجِ خسروی شانِ حکومت ہیچ ہے
بیش و کم پر جس کے حاصل ہو نہ قدرت ہیچ ہے　　طاقِ کسریٰ جامِ جم قاروں کی دولت ہیچ ہے

حسنِ یوسف موجبِ تسکینِ قلبِ زار نیست
خاتمِ دستِ سلیماں گر بود درکار نیست

تلخ کامی جس کا آخر ہو وہ لذت کیا کریں ۔۔۔ غم لگا ہو جس کے پیچھے ایسی راحت کیا کریں
بیش و کم جب کہ حاصل ہو نہ قدرت کیا کریں ۔۔۔ اپنی خواہش کے مخالف سے محبت کیا کریں

خاک ایسے عیش پر جو موردِ آلام ہو
کیا خوشی اس زیست کی جس کا فنا انجام ہو

کیا ہے دنیا اک زنِ غدار و بے مہر و وفا ۔۔۔ چین سے جس جا میں سلطاں ہو نہ راحت سے گدا
پالتی ہے ناز و نعمت میں جنہیں صبح و مسا ۔۔۔ حلق پر ان کے پھرا دیتی ہے شمشیرِ جفا

فضل میں جن کو زمانے سے بڑھا دیتی ہے یہ
اپنے ہاتھوں خاک میں ان کو ملا دیتی ہے یہ

جس کی طولِ عمر کا ہوتا ہو خواہاں اک جہاں ۔۔۔ یہ کبھی دیتی نہیں اس کو حیاتِ جاوداں
بات کل کی ہے ہوا اٹھا دنیا سے وہ والا مکاں ۔۔۔ ہو بجا گر اس کو کہئے سارے امروہہ کی جاں

مقتدا و پیشوائے مومناں رحلت نمود
وا دریغا از جہاں استادِ ما رحلت نمود

تا قیامت سیکڑوں دنیا میں ہوں گے باکمال ۔۔۔ پر ملے ثانی اولادِ حسن ہے یہ محال
تھا وجودِ پاک اس کا وہ تقدس کی مثال ۔۔۔ جس پہ ہو جاتا تھا لوگوں کو ملک کا احتمال

ایک مجموعہ تھا وہ گلہائے رنگا رنگ کا
اب ڈھونڈے سے ملے گا مولوی اس ڈھنگ کا

اہلِ امروہہ کہاں پائیں گے ایسا پیشوا ۔۔۔ مردِ متقی پاک باطن تارکِ حرص و ہوا
خلق اس کا تھا نمونہ خلقِ اہل اللہ کا ۔۔۔ سادگی بے پایہ پر سو تکلف تھے فدا

خود ستائی خود نمائی سے وہ کوسوں دور تھا
زاہدِ پاکیزہ خو تھا عابدِ بے زور تھا

یوں تو اہلِ علم ہم نے سیکڑوں دیکھے مگر — اس کا عالم اور تھا وہ تھا کوئی نرہادگر

علم تھا اس کے عمل کے ساتھ پیہم جلوہ گر — جیسا ظاہر ویسا باطن ایک حالت سر بسر

دنیا سازی کا طریقہ اس کو آتا ہی نہ تھا

وہ طریقِ راستی سے ہٹ کے جاتا ہی نہ تھا

بے محل رو رعایت سے طبیعت تھی نفور — چاپلوسی اور خوشامد سے بری نخوت سے دور

نے تعلی نے مشیخت نے تکبر نے غرور — خوش ہو ناخوش ہو کوئی حق بات کہتا تھا ضرور

ڈگمگاتے سفینے دیکھیں جہاں ابرار کی

اس کی غیرت نے سدا بے لاگ کشتی پار کی

اہلِ ثروت سے کبھی ہوتا نہ تھا خواہاں نہ — گو کہ تھی تنگیِ معیشت مؤلمِ قلب و جگر

نامساعد بخت کا شکوہ نہ آیا عمر بھر — شکرِ خالق تھا غرض جس حال میں ہوتی بسر

فرق آتا تھا کبھی ہرگز نہ اس کی شان میں

درد میں تکلیف میں افلاس میں بحران میں

گو ستاتے تھے حسد سے اس کو اہلِ بغض و کیں — لیکن اس کی ذات سے ایذا کبھی پہنچی نہیں

حادثاتِ دہر سے ہوتا نہ تھا اندوہگیں — حق نے بخشا تھا اسے نفسِ طمانیت قریں

تھا مقرِ اخلاقِ نیکو کا ہر اک میر و گدا

تھا رئیسِ قوم لیکن جھک کے ملتا تھا سدا

تھی عیاں سادہ روی اس کے ہر اک کردار سے — طرزِ پوشاک سے رفتار سے گفتار سے

یہ تمسک تھا حدیثِ احمدِ مختار سے — اپنا سودا جا کے لے آتا تھا خود بازار سے

سامنے موجود گرچہ بیٹے تھے خدمت گزار

لیکن اس کا تھا عقیدہ اپنا کندھا اپنا بار

ذات اس کی ایک دریا تھی کہ جس کا کلام — شعبہ ہائے علم و فن کی بہتی تھیں نہریں تمام
علم فقہ اور حدیث و علم تفسیر و کلام — فن شعر و شاعری انشا و تجوید و کلام

تھا ادیب بے مثال و خوشنویس بے مثل
نسخ و نستعلیق دونوں خط تھے جس کے بے بدل

اس کا حجرہ اہل حاجت کا تھا مرجع اور کبھی — تھا کبھی شعر و سخن جس میں کبھی درسِ کتاب
گر کتابت کا سبق تھا گر مسائل کا جواب — گاہ پند و گاہ ذکر خاندان بوتراب

اہل حاجت کی صدا سن کر وہ گھبراتا نہ تھا
ہاتھ خالی آکے اس در سے کوئی جاتا نہ تھا

گفتگو میں حق نے بخشا تھا عجب لطف و اثر — انتہائی شوق سے سنتا تھا جس کو ہر بشر
وہ حلاوت جس کے آگے ہیچ تھی نخلِ شکر — بات میں اک بات تھی نکتہ میں نکتہ جلوہ گر

آہ خوابے بود آنچہ گفتم و باقی نماند
وادریغا آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

دور بھی دنیا سے تھا اور اس پہ دنیا دار بھی — باوضع منکسر طبیعت بھی اور خوددار بھی
خوش گلو بھی خوش سخن بھی اور خوش گفتار بھی — نغز گو تھے خوب بھی فخر اولی الابصار بھی

قوم کا مخدوم تھا۔ سادات کا سالار تھا
تھا خوشی میں خوش اگر تو غم میں ماتمدار تھا

اس کے حسنِ خلق نے ایسا کیا تھا کچھ اثر — بن گیا تھا بندۂ بے دام ہر فرد بشر
ہو غنی یا بے نوا کرتا تھا وہ یکساں نظر — ایک شمع تھی کہ پروانہ تھا جس کا شہر بھر

جھک کے ملتا تھا سدا نخوت کی اس میں بو نہ تھی
دل گرفتہ ہو کوئی جس سے وہ اس کی خو نہ تھی

جا بجا میں کھوٹے کھرے کی جب آ پا تھا خلل — تھے لباس علم میں ملبوس کچھ اہل دغل
دین حق کے پیشوا بنتے تھے ارباب جہل — مولویت عقدۂ دزدی کو جب کرتی تھی حل

اس نے اک سچا نمونہ خلق کو دکھلا دیا
مولوی بے ریا کس کو کہیں سمجھا دیا

گرچہ وہ ذی اجتہاد و صاحب فتویٰ نہ تھا — پر تبحر اس کا تھا حیرت فزا معجز نما
علم فقہ کے وہ مشکل مسئلے جن میں سدا — امتحاں لیتے رہے ہیں لوگ اہل علم کا

ذہن میں حافظ تھے انکے یوں کہ بے دیکھے کتاب
خواب میں بھی پوچھتا کوئی دے دیتا جواب

نسخ و نستعلیق دو نو خط تھے ایسے بے گماں — مانتے تھے جن کی خوبی خوش نویسان جہاں
ہا لکھتا موتی چلا جاتا تھا کلک درفشاں — صدقے ہر نقطے پہ ہوتیں سو سو قطع کاریاں

لکھ گیا ہے جو قلم سے وہ در و دیوار پر
آج تک تکتے ہیں حیرت سے اسے اہل نظر

اس کو فن شعر میں حق نے دیا تھا وہ کمال — محو جس سے ہو گیا تھا میر و مرزا کا خیال
وہ سلاست وہ لطافت وہ تخیل وہ مقال — لائے گا کوئی کہاں سے گو یہ امر محال

سب ہیں شاعر یوں تو لیکن وہ سخنور اور تھا
طبیعت اور ہی کچھ تھی وہ جوہر اور تھا

مرغ لا خواب غفلت سے جگا کر چل دیا — جام الفت اپنا ہم سب کو پلا کر چل دیا
چار جانب علم کے دریا بہا کر چل دیا — عندلیب خوش نوا نغمے سنا کر چل دیا

محفلیں برہم ہوئیں موقوف صحبت کل ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی آج وہ بھی گل ہوئی

کس کے در پر حاجتوں کو لیکے جائیگا کوئی — کتنے اب کس سے مکانوں پر بلائیگا کوئی
کس سے نظم شعر پر اصلاح پائے گا کوئی — اب شفاعت پوتوں میں کاہے کو جائیگا کوئی

فیض جس سے شہر کو ہوتا تھا وہ دریا نہیں
سب ہی لیکن جناب قبلہ و کعبہ نہیں

[illegible]

میری چوتھی درسگاہ

سرکار نجم العلماء کے قائم کردہ مدرسۃ الناظمیہ نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کرلی تھی اور طالبان علم دور دور سے لکھنؤ کھچے چلے آرہے تھے ابتدائی چند سالوں میں کتنی نامور فاضل ایسی ٹھوس قابلیت کے فارغ التحصیل ہو کر نکلے جن سے اس کی شہرت کو اور چار چاند لگ گئے۔ جیسے شمس العلماء مولانا سبط حسن صاحب قبلہ مولانا حافظ فرمان علی صاحب قبلہ مولانا محمد ہارون صاحب قبلہ لکھنؤ کے مدارس وہاں کی تہذیب اور صاحبان فضل و کمال کے حالات بچپن سے گوش گزار ہو رہے تھے دلی خواہش تھی کہ اس سرزمین کو میں بھی دیکھوں۔ لیکن یہ آرزو پوری ہونے میں دیر آتی تھی۔

میرے ایک ہم محلہ مولانا سید سعید حسن صاحب کئی سال سے مدرسۃ الناظمیہ میں تعلیم پا رہے تھے وہ عشرہ محرم میں امروہہ آئے ہوئے تھے انہوں نے وہاں کے حالات بیان کئے اور داخلے کی ترغیب دلائی صلاح و مشورہ کے بعد ہم تین آدمیوں میں مولانا سید محمد صاحب ساکن محلہ بچھڑہ اور مولوی سید قمر حسن صاحب ساکن محلہ سدّو

لکھنؤ جانے پر تیار ہو گئے۔ عشرۂ محرم کرتے ہی ہم روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مدرسۂ ناظمیہ میں داخلہ لیا۔ مدرسے کے دروازہ کے اوپر جو کمرہ تھا اس میں ہمارا قیام ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۷ء کا ہے یعنی اب سے ۶۲ برس پہلے کا ہے۔ اس وقت اس مدرسہ میں پچاس ساٹھ طالب علم سب جماعتوں میں تھے جن میں میرے دوست خطیب اعظم مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی بھی شامل تھے۔

دو تین دن تو خوب سیر سپاٹا رہا تمام مشہور مقامات جا جا کر دیکھے۔ اس زمانہ میں جا بجا مجالس ہو رہی تھیں ان کا پر تکلف اہتمام و انتظام بھی دیکھا۔ علماء کے وعظ اور نامور شعراء کا کلام بھی سنا جو ہمارے لئے ایک نئی چیز تھی اگرچہ لکھنؤ اس وقت ایک مٹی گھسٹی دلہن تھا مگر ہماری دل فریبی اور نظر نوازی کے لئے گیا گزرا سنگھار بھی کافی تھا وہاں کی ہر ادا پیاری لگتی تھی اور قبلۂ قبل والی تہذیب کی طرف دل کھنچتا تھا۔

مجالس میں سفید چاندنیوں کے فرش جنت نگاہ مدریا مختلف شکلی خیزوں کی مشام نواز خوشبو اڑاتے ہوئے پانی کی گھڑوں اور مشکوں کی گردنوں میں پھولوں کے ہار لٹکتے ہوئے گلوریوں کے بھرے خاصدان اگر اور لوبان کے مشام پرور بخورات لپٹہ کی ہوا تی والے پر تکلف شربت عزاخانوں کی قابل دید آرائش۔ سامعین کی نشستی تہذیب۔ شائستہ گفتگو کہیں اوج صاحب پڑھ رہے ہیں تو کہیں عارف صاحب کہیں پیارے صاحب رشید تو کہیں دولہا صاحب بے پناہ مجمع ہے ایک ایک مصرعہ پر لوگ کھڑے ہو ہو کر داد دے رہے ہیں رومال ہل رہے ہیں واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے چھتیں اڑی جا رہی ہیں ہم دیہاتیوں نے یہ وجد آفریں اور پر کیف مناظر کہاں دیکھے تھے۔

مدرسۂ ناظمیہ میں اُس وقت چار عالم درس دیتے تھے سرکار نجم العلما مولانا سید سبط حسن صاحب مولانا سید محمد صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب کشمیری۔ ہم تینوں کا داخلہ فاضل کے درجہ میں ہوا۔ چاروں علماء سے درس کا تعلق رہا

اس زمانے میں دو مدرسے خاص طور سے مرجع خاص و عام تھے۔ ایک ناظمیہ جس کے بانی و سرپرست سرکار نجم العلما تھے دوسرے سلطان المدارس جس کے صدر مدرس جناب سرکار حجۃ الاسلام سید باقر صاحب قبلہ تھے۔

مدرسۂ ناظمیہ میں ہر طالب علم کو مدرسہ کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ ایک پرانے طالب علم جو شاید نسلاً بعد نسل اس مدرسے میں طالب علمی کے لئے داخل ہوتے تھے داروغۂ طعام تھے۔ علم میں تو دو چار ہی قدم تھے۔ مگر داروغگی کے ہاتھ لمبے لمبے تھے ہفتہ میں دو روز گوشت اور پانچ روز دال ہر طالب علم کا نوشتۂ تقدیر تھا۔ جیسی دال پتلی ویسی ہی روٹیاں۔ جب تک امروہہ کی آب و ہوا کا اثر رہا چار چپاتیاں ہو گئے ناشتہ تھیں لیکن جب لکھنؤ کی آب و ہوا معدہ میں رچ بس گئی تو ان کے ہضم کرنے کے لئے چورن درکار تھے۔ ابتدائی ایام میں ایک روز سرکار نجم العلماء سے عرض کیا حضور چار چپاتیوں میں پیٹ نہیں بھرتا کچھ اضافہ ہو جائے تو اس دیو شکم کی تڑپ کچھ تو کم ہو فرمایا کم کھانا مصلحتاً دیا جاتا ہے تاکہ شکم سیری کی صورت میں بدن سست نہ ہو اور کتابوں کے مطالعے میں خلل واقع نہ ہو پیٹ بھر کر کھاؤ گے تو نیند جلدی آ جائے گی اور ایک طالب علم کے لئے یہ دونوں باتیں مضر ہیں کچھ دنوں بعد اس شکایت کی ضرورت ہی نہ تھی ہم تھے اور دو چپاتی بلکہ

نیم نانے گر خورد مرد خدا   بذل درویشاں کند نیمے دگر

جب معدہ کی اچھی طرح اصلاح ہوگئی تو وہ ایک درویش بے نوا کی طرح سکڑ کر رہ گیا۔
ایک روز امروہہ کے وکیل سید معجز حسین صاحب نے ہماری دعوت کی لذیذ کھانے اور بکثرت خدا سے دعا کی آج معدے کی گتھریاں کھول دے ہمیں امروہیہ بنا دے۔ ہمت مرداں اور مدد خدا خوب ڈٹ کر کھایا اور معدہ کی کوئی کروٹ مالا مال کئے بغیر نہ چھوڑی کھانا آسان تھا کھا کر گرتے پڑتے چلے اب رات تھی اور ہم تھے اب سمجھے کہ ہم لکھنؤ میں ہیں توبہ کرلی کہ اب کبھی کھاتے وقت امروہہ یاد آئے گا ؎

تمام شب بچو مرغ بسمل ادھر تڑپنا ادھر تڑپنا

یوں رات گزاری۔

اب تک تعلیم میں جو وقت گزرا تھا وہ انفرادی حیثیت سے تھا یعنی ہم تھے اور اپنا گھر اور کتاب لیکن اب ایک اجتماعی نظام کے ساتھ چلنا تھا لہٰذا اس جدید معاشرے سے دل و دماغ پر مختلف قسم کے نقوش مرتسم ہوتے رہے اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھنے کا ولولہ بھی تھا۔ ترقی کے اسباب کی جستجو بھی تھی بس سوسائٹی میں ہر دل عزیز بننے کا شوق بھی تھا اور اس ظریفانہ چھیڑ چھاڑ میں حصہ لینا بھی جو ایک طالب علم کی دماغی تکان دور کرنے کے لئے ایک طاقتور تفریح بھی بڑی ضروری تھا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ جب چند زندہ دل نوجوان کسی جگہ جمع ہوتے ہیں بالخصوص طلبا تو ایسی میں چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق بھی ضرور ہوتا ہے کبھی جنب کبھی حامیانہ۔ مزاح المومنین کو تو حدیث میں خیر کہا گیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو کتب بینی کے بعد مضمحل دماغوں میں تازگی کیسے پیدا ہو اور ایک طالب علم ملائے خشک بن کر رہ جائے چنانچہ یہ ضرورت مدرسہ نظامیہ میں بھی پوری ہوتی رہتی تھی مدرسہ میں ایک حوض تھی

شام کو عموماً طلبا اس کے گرد جمع ہو کر ظرافت طبع کے جوہر دکھاتے۔

مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی لطیفہ گوئی بذلہ سنجی اور تمسخر و دل لگی میں سب پیش پیش تھے یہ ان کی طبیعت ثانیہ اور سید اکتسی جذبہ تھا جو آج تک موجود ہے۔ اگرچہ بتقاضائے سن اب یہ رنگ پھیکا پڑ گیا ہے افسردہ طبیعتوں کو کھل کھلا دینا، روتوں کو ہنسا دینا اور مجمع کو اپنی طرف متوجہ کر لینا ان کی زبان کا خاص جوہر ہے۔ اگر اس زمانے کے چند لطیفے لکھ دوں تو خالی از لطف نہ ہوں گے۔

(۱) ایک طالب علم کا نام ابو الفرج تھا تمام طالب علم ان کو ابو الفرج کہہ کر پکارتے تھے ایک صاحب فضل علی تھے ان کو قفل علی کہا جاتا تھا۔

(۲) ایک بزرگ کئی ماہ سے سرکار نجم العلما کے مہمان تھے نہ جانے کا نام لیتے تھے نہ اپنے پاس سے کھاتے تھے ہمارے ہی کمرہ میں مقیم تھے ان کی وجہ سے ہماری آزادی میں فرق آگیا تھا اور ان کی پے در پے فرمائشوں سے طلبا اکتا گئے تھے بغیر پیسہ خرچ کیے آرام سے رہنا چاہتے تھے۔ ایک دن شدت کی گرمی تھی دوپہر کے وقت ایک برف کی قلفی والا اس کوچے سے گزرا جس میں مدرسہ تھا ہمارے کمرہ کا پشت کی طرف والا کواڑ کوچہ کی طرف کھلتا تھا بڑے میاں نے وہاں کھڑے ہو کر قلفی والے کو جو ذرا دور نکل گیا تھا پکار کر کہا یہاں لے آ۔ وہ قلفیوں سے بھری مٹکی سر پر رکھے مدرسہ کے صحن میں آیا بڑے صاحب نے حکم دیا اوپر آ۔ وہ غریب سیڑھیاں پار کر کے جب چھت پر آیا تو بڑے صاحب نے کہا ایک پیسے کا برف دے یہ سنتے ہی وہ جھنجھلا گیا۔ اور اول فول بکنے لگا اور لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ شور و غل سن کر طلبا اکٹھے ہو گئے۔ اور بڈھے کی حماقت پر ہنسنے لگے۔ مولوی سعید حسن کی ظرافت اس وقت کام آگئی

قلفی والے کو بلا کر اس کے کان میں ایک ایسی بات کہی کہ وہ فوراً اپنی مٹکی اٹھا کر چلا گیا۔ بڑے صاحب کا اضطراب دور ہوا خوش ہو کر مولوی سعید حسن صاحب سے پوچھنے لگے بیٹا تم نے اس سے کیا کہا کہ فوراً چل دیا۔ انہوں نے کہا میں نے اس کو بتایا کہ یہ تحصیلدار صاحب کے ابا جان ہیں چپ چاپ چلا جا ورنہ تحصیلدار کو خبر ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور آفت میں جان آ جائے گی بڑے صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میں تمہاری ذہانت کی داد دیتا ہوں جب ہم لڑکوں نے پوچھا تو کہنے لگے میں نے اس سے کہا کس کے منہ لگ رہا ہے یہ تو دیوانہ ہے اپنی مٹکی اٹھا کر چل دے ورنہ باؤلے کا ہاتھ کون پکڑے گا سپاہیوں کو بلا یا ہو گا اسے پاگل خانے لیے جائیں۔

(۵) ایک بزرگ ایک روز سرکار نجم العلماء سے کہنے لگے کہ سرکار آپ بہت کمزور ہیں اور دماغی کام زیادہ کرنا پڑتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ نصیب دشمناں آپ بیمار پڑ جائیں میرے پاس مقوی حلوے کا ایسا نسخہ ہے کہ بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے صرف ۱۵ روپے میں تیار ہوتا ہے جناب نے فرمایا مجھے جوان بن کر کیا کرنا ہے۔ بڑے صاحب نے جب تعریفوں کے پل باندھے اور اصرار کیے چلے گئے تو اخلاقاً جناب خاموش ہو گئے اور مصلحت سمجھ کر پندرہ روپیہ ان کے حوالے کر دئے بڑے صاحب نے سوجی کا حلوہ بنا کر ایک پیالے میں دبا دبا کر بھرا اور پیالہ رومال میں باندھ کر بھاری الماری میں رکھ دیا طلبا بڑے میاں کا یہ سب عمل دیکھ رہے تھے صلاح ہوئی اس پر جادو کا ڈنڈا پھرانا چاہیے۔ رات کو اس پیالے کو بے کر الٹا تو جما ہوا حلوا باہر آ گیا اس کا نیچے کا حصہ چاقو سے کاٹ کر پھر جما دیا۔ دوسرے روز جناب مدرسہ میں تشریف لائے تو بڑے صاحب رومال میں بندھا پیالہ مع ایک چھوٹے سے چمچے کے لے کر حاضر ہوئے۔ طالب علم بھی جمع ہو گئے۔

بڑے صاحب نے کہا سرکار یہ بڑی قیمتی ادویہ سے بڑی محنت کے بعد تیار کیا گیا ہے میری خواہش ہے کہ سرکار ایک چمچہ میرے سامنے کھا لیں۔ جناب نے مسکرا کر فرمایا طلبا کو دماغی قوت کی زیادہ ضرورت ہے ایک ایک چمچہ ان کو کھلائیے۔ یہ سنتے ہی ایک طالب علم نے وہ پیالہ اٹھا لیا اب جو چمچہ مارا تو حلوہ پیالے کے پیندے میں تھا لڑکوں نے کہا حضور ہم نہ کھائیں گے یہ بڑا زہریلا حلوہ ہے جس نے رات بھر آدھے سے زیادہ اپنے آپ کو کھا گیا وہ تو ہماری آنتیں کاٹ کر رکھ دیگا جناب یہ سن کر مسکرائے اور بڑے صاحب غصے میں بھرے یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے یہ سب شرارت ان طالب علموں کی ہے۔

(۲) جب بڑے صاحب کا کھانا جانا یہاں سے بند ہو گیا تو اب اپنے پاس سے کھانے کا مرحلہ پیش آیا۔ ایک روز مولوی سعید حسن کو دو آنے کے پیسے دے کہ کوئی اچھا کھانا لے آؤ وہ ایک آنہ کی روٹی اور ایک آنہ کا قورمہ لائے بڑے صاحب نے جب ذرا سے شوربے میں دو بوٹیاں دیکھیں تو بہت جز بز ہوئے کہنے لگے تم میرے پیسے ڈبو آئے بندۂ خدا اس ذرا سے شوربے میں چار روٹیاں بھگو کر کیسے کھاؤں گا انہوں نے کہا تو کیا وہ چار پیسے میں ایک بھری تھیلی دیدیتا۔

شام کو پھر ضرورت ہوئی دو آنے دے کر بڑی خوشامد سے کہا بیٹا ذرا شوربا زیادہ لانا چاہیے بوٹی ایک ہی ہو انہوں نے کہا اب میں آپ کی ضرورت کو سمجھ گیا۔ پیالہ بھر کر لاؤں گا چنانچہ راستہ میں ایک پانی کے پمپ سے شوربے میں اتنا پانی بھرا کہ وہ چھلکنے لگا رات کا وقت تھا اور بڑے صاحب کی بینائی کمزور شوربے کا بھرا پیالہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے صبح تمہیں دوکاندار نے ٹھگ لیا اس ایک آنہ کا اتنا

شوربا تو ہو اب جو کھانے بیٹھے تو وہاں پانی کے سوا کیا تھا کہنے لگے لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا لے آئے یہ تو نرا پانی ہے نہ نمک نہ مرچ انہوں نے کہا بڑے صاحب یہ نیا کھانا ہے۔ یہاں کے امراء بڑے شوق سے کھاتے ہیں ایران میں اس کو آب گوشت اور لکھنؤ میں کچھو چھا شریف کہتے ہیں بہترین کھانوں میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس سے معدہ میں سوزش نہیں ہوتی۔ بڑے میاں نے جھلا کر کہا لعنت ہے اس کچھو چھا شریف پر یہ کہہ کر غصہ میں زمین پر دے مارا اور کہا لعنت ہے ان امیروں پر جو اسے لذیذ کھانا کہتے ہیں بڑے میاں رات کو بھوکے سوئے لڑکے تو یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ یہاں سے چلے جائیں یہ سب کارروائیاں باہمی مشورے سے ہوتی تھیں۔

بڑے میاں اب مولوی سعید حسن سے خفا ہیں دوسرے روز ایک اور لڑکے کو بلا کر کہا میں تو سعید کو بڑا ہوشیار جانتا تھا مگر یہ تو بالکل نکھٹو نکلا۔ آج بیٹے تم کھانا لاؤ۔ کیسا اچھا لاتے ہو۔ مزیدار بھرا ہوا پیالہ۔ وہ لڑکا بڑا تیز طرار تھا اس نے کہا آپ نے کبھی شکنبہ بھی کھایا ہے بڑا ہی لذیذ ہوتا ہے نان نہاری کی جگہ لوگ اسی کو کھاتے ہیں کم خرچ اور بالا نشین۔ بڑے صاحب خوش ہو کر کہا ہاں بس یہی لے آؤ شکنبہ کہتے ہیں جانوروں کے پیٹ کی اوجھری کو جو لکھنؤ میں انگریزوں کے کتوں کے لئے نمک ڈال کر پکائی جاتی تھی لڑکا گیا اور شکنبہ کا بھرا پیالہ لا کر سامنے رکھ دیا بڑے میاں نے دیکھا تو سر پیٹ لیا ارے میاں یہ کیا بلا لے آئے۔ لاحول ولا قوت میرے پیسے بھی کھوئے۔ واہ رے لکھنؤ تیرا اور تیرے کھانوں کا کیا کہنا۔ اس کے بعد یہ بلا طلباء کے سر سے ہٹ گئی

(۱۵) اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ اور قلم بند کر کے اس ظرافت کے شمارہ کو بند کر دوں گا

ایک بزرگ یکم محرم سے ۱۲ ربیع الاول تک مجلسیں کرتے تھے، ان کو ہر روز ایک ذاکر کی تلاش رہتی تھی ایک روز شام کو وہ مدرسہ میں آگئے لڑکے حوض کے چاروں طرف جمع تھے انہوں نے کہا مولوی صاحبان پرسوں کے لئے کسی ذاکر کو بتایئے ایک چلبلے طالب علم نے کہا مولوی محمد حسین صاحب کشمیری سے وعدہ لیجئے بہترین ذاکر ہیں انہوں نے کہا میں نے تو آج تک انہیں نہیں سنا۔ لڑکے نے کہا باہر والے چھوڑتے کب ہیں کہ آپ سنتے۔ آپ کل مدرسہ میں تشریف لے آئیں ہم لوگ سفارش کر کے وعدہ کرا دیں گے۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ صبح دس بجے آموجود ہوئے۔ مولانا کشمیری صاحب بہت سیدھے سادے مولوی تھے ذاکری کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا وہ تو صرف درس دینا جانتے تھے جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا میں تو آج تک منبر پر گیا ہی نہیں لڑکوں نے شور مچایا حضور منظور کر لیجئے وہ انکار کرتے رہے اور لڑکوں نے کہنا شروع کیا جایئے وعدہ ہو گیا۔ کل مولانا مجلس پڑھینگے۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلے تو ایک لڑکے نے بڑھ کر کہا مولانا فرماتے ہیں کہ اگر مجھے پڑھوانا ہے تو تمام علمائے کرام کو اس مجلس میں مدعو کیا جائے۔ انہوں نے کہا میں پوری کوشش کروں گا۔ لڑکے یہ تو جانتے تھے کہ مولانا پڑھنا نہیں جانتے لہذا اصلاح ہوئی کہ کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہیئے کہ مولانا کو ندامت نہ ہو ایک حکیم نکالی اور مولانا سے کہا حضور براہ راست تشریف نہ لے جائیں بلکہ یہاں تشریف لے آئیں ہم سب آپ کے ساتھ چلیں گے۔

دوسرے روز مولانا تشریف لے آئے۔ مکان مجلس مدرسے سے قریب تھا مولانا کے ساتھ پچاس ساٹھ طلبا درود کے نعرے لگاتے چلے معلوم ہوتا تھا

کوئی جلوس آرہا ہے۔ علمائے کرام مجلس میں تشریف لاچکے تھے جب شور سنا تو
پوچھا یہ کیا ہے کسی نے بتایا ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں درود کے ساتے میں
ان حضرات کو تعجب ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں جو اس ٹھاٹ سے آرہے ہیں۔
جب مرکان مجلس میں یہ جلوس داخل ہوا تو دیکھا سرکار ناصر الملت جناب
نجم العلماء، جناب سید باقر صاحب جناب مولانا ظہور حسین صاحب جناب مولانا آقا
حسن صاحب تشریف فرما ہیں مولانا کشمیری صاحب کو پسینہ آگیا اور پیر لڑکھڑانے
لگے بمشکل منبر تک پہنچے۔
بہرحال وہ وقت آگیا کہ بانی مجلس نے دست بستہ عرض کی حضور بسم اللہ
مولانا کی پریشانی قابل دید تھی جیسے تیسے منبر پر تشریف فرما ہوئے خطبہ لرزتی آواز
میں شروع کیا ابھی اتنا ہی کہا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد
للہ رب العالمین کہ لڑکوں نے منھ پر رومال رکھ کر رونا شروع کیا۔ دس
منٹ تک اس طرح چیخ و پکار رہی کہ مولانا کے ہونٹ تو ہلتے نظر آئے مگر کسی کی
سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ رہے ہیں اس کے بعد ایک لڑکے نے مولانا کا پیر دبا کر
اشارہ کیا کہ اب اتر آئیے خوب پڑھا۔
اثنائے ذکر میں علمائے کرام منھ سے رومال ہٹا ہٹا کر دیکھتے رہے کہ
کیا ہو رہا ہے جب مولانا اتر آئے تو ہر طرف سے آواز آنے لگی کہ اے سبحان اللہ
کیا مجلس ہوئی۔ ایک بوڑھے نواب صاحب میرے قریب بیٹھے تھے۔ فرمانے
لگے واللہ باللہ کیا خوب مجلس ہوئی ایسا گریہ میں نے آج تک لکھنؤ کی کسی مجلس
میں نہیں دیکھا مگر یہ پتہ نہ چلا کہ قبلہ و کعبہ نے پڑھا کیا۔

اس قسم کے مزاح اکثر ہوتے رہتے تھے طلبا کی ان گستاخیوں سے استاد صاحبان اگر کبھی سن لیتے تھے تو غض بصر کرتے تھے زیادہ جھگڑ بازی پر ڈانٹتے بھی تھے چنانچہ اس موقعہ پر سرکار نجم العلما رنے بہت ملامت کی اور آئندہ ایسی حرکت سے منع کیا۔

اُس وقت کے علمائے لکھنو

ماشاء اس وقت لکھنو اہل علم و فضل کا مرکز تھا ان میں پانچ مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں تھیں۔

(۱) سرکار ناصر الملت مولانا السید ناصر حسین صاحب قبلہ

(۲) سرکار نجم العلما مولانا السید نجم الحسن صاحب قبلہ

(۳) سرکار باقر الملت مولانا سید باقر صاحب قبلہ۔

(۴) سرکار قدوۃ العلما مولانا السید آقا حسن صاحب قبلہ

(۵) سرکار ظہور الملت مولانا السید ظہور حسین صاحب قبلہ۔

سبحان اللہ ان مقدس ہستیوں کا کہنا مدت العمر دین مبین اور مذہب ائمہ طاہرین کی بہترین خدمت انجام دیتے رہے۔ ان پاک نفس وجودوں سے علوم ائمہ کی بڑی زبردست تبلیغ ہوئی ان کے افاضل تلامذہ نے جو دعلم دین کے ستون تھے ہندوستان کے ہر حصہ میں پہنچ کر ہدایت کی اور جابجا دینی مدارس قائم کے علمی فیوض و برکات کے دریا بہائے۔

ان حضرات مجتہدین کے روحانی اثرات بے پناہ تھے ان کی آوازوں میں زور تھا ان کے چہروں پر علمی وقار تھا ان کے سامنے لوگوں کو لغو کلام کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ خلاف شرع کسی امر کو دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے ان کی بات میں کتنا وزن تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سرکار ناصر الملت نے تبرا ایجی ٹیشن کے موقعہ پر یہ آواز بلند کی تھی ھل من ناصر ینصرنا۔ جس کے نتیجے میں تمام ہندوستان ہل گیا اور ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں سے مومنین کھنچ کھنچ کر لکھنؤ نہ پہنچے ہوں۔ رؤسا، تعلقہ دار اور والیان ملک نہایت ادب کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھتے تھے اور نہایت منکسرانہ اور متواضعانہ انداز میں ان سے کلام کیا کرتے تھے۔ یہ حضرات جب بھی کہیں جاتے فنس میں سوار ہو کر جاتے۔ ہر مجتہد کے یہاں ایک فنس اور چار کہار رہتے تھے میں بہ حیثیت ایک طالب علم کے ان سب حضرات کی خدمت میں گاہ گاہ جاتا تھا جس زمانہ میں میں تعلیم پا رہا تھا شمس العلما مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اور فلسفی دوراں جناب مولانا محمد رضا صاحب قبلہ کا طوطی بول رہا تھا۔ ان حضرات کی مجالس میں بے پناہ مجمع ہوتا تھا۔ دونوں صاحبان کا اسلوب بیان بڑا دلکش تھا مولانا سبط حسن صاحب کا بیان ان من البیان لسحرا کا صحیح مصداق تھا ایک ایک جملہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا زبان سے نکلتا تھا فقرات کا سلسلہ تھا کہ ریشم کے لچھوں میں موتیوں کی لڑیاں تھیں۔ ایسا قادر الکلام واعظ آج تک پیدا نہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا نے ایک مجلس ڈیڑھ گھنٹہ تک شہد کی مکھی پر پڑھی کوئی جملہ لطافت سے خالی نہ تھا۔ شعرا۔ ادبا۔ علما و فضلا وجد میں سر دھنتے رہتے تھے۔

مولانا محمد رضا صاحب مرحوم کا بیان فلسفیانہ ہوتا تھا۔ مذہب حقہ کی تائید میں ایسے ٹھوس دلائل بیان کرتے تھے کہ منصف مزاج مخالف کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ تھا تقریباً دس سال مولانا مرحوم نے امروہہ میں عشرۂ اربعین پڑھا ان مجالس کا نقشہ اب تک پیش نظر ہے اور مولانا کا پُر از دلائل بیان پردۂ گوش سے ٹکرا رہا ہے۔

میری پانچویں درسگاہ

فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں ممتاز الافاضل کے درجہ میں آیا تو وقت کی ناسازگاری اور خانگی معاملات کی پیچیدگی نے مجھے امروہہ رہنے پر مجبور کیا چنانچہ ایک سال ۶ ماہ بعد میں امروہہ آگیا سہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

حالات کے تغیر نے اس طرف توجہ دلائی کہ سرکاری امتحانات پاس کر کے کسی اسکول میں ملازمت کرلوں حسن اتفاق سے اس زمانے میں جناب مولانا سید جواد حسین صاحب قبلہ ممتاز الافاضل گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ میں ہیڈ مولوی تھے۔ صاحب نفس قدسیہ ہونے کے علاوہ عربی اور فارسی ادب میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے اور درس دینے کے شائق تھے۔

مولوی سید علی یاور صاحب ساکن محلہ مجلہ میور سنٹرل کالج الہ آباد کے امتحان ملا کی کتابیں مولانا سے پڑھ رہے تھے میں بھی ان کے درس میں شریک

ہوگیا۔ اس امتحان کی تیاری کے لئے مجھے صرف چھ ما ت ملا مگر جناب مولانا کی سعی جمیل اور اپنی لگاتار محنت سے میں کامیاب ہوگیا اور ن یاور صاحب فیل ہو گئے۔ چونکہ ہم دونوں میں برادرانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ اس لئے مجھے ان کے فیل ہونے کا بے حد صدمہ ہوا۔ دوسرے سال میں نے فاضل کا اور علی یاور صاحب نے ملا کا امتحان دیا۔ بحمداللہ ہم دونو کامیاب ہوگئے۔

جس سال میں امتحان ملا کی شرکت کے لئے الٰہ آباد گیا تھا تو اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر والد مرحوم نے بتاکید کہہ دیا تھا کہ مولانا کرامت حسین سے جو اس زمانہ میں ہائی کورٹ کے جج تھے ضرور ملنا۔ چنانچہ میں اور علی یاور صاحب دونوں ان کی کوٹھی پر گئے۔

عندالملاقات جج صاحب نے کہا آپ نے کچھ انگریزی بھی پڑھی ہے میں نے کہا نہیں فرمایا تو پھر میر صاحب آپ کو مردہ شو مولوی بنانا چاہتے ہیں صاحبزادے رو کھے سوکھے مولوی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ ایک مولانا صاحب ایک سفارش کے لئے لکھنؤ سے یہاں آئے۔ اور میرے یہاں ٹھہرے رات کو جب میں نے کھانے پر بلایا تو تکلف کر گئے۔ اور کہنے لگے میں نے راستے میں کھالیا تھا۔

گرمی کا موسم تھا رات کو انہوں نے کپڑے اتارے اور لنگی باندھ کر سونے کو لیٹے۔ مگر بھوک میں نیند کہاں۔ جب دیو اشتہا کو نہ دبا سکے تو باورچی خانے میں پہنچے کہ کچھ بچا ہوا مل جائے تو کھالیں اندھیرا گھپ تھا۔ تلاش میں

ہاتھ گھنچتی ہوئی ہتھیلیوں پر جا پڑا وہ کھن کھن نیچے گر پیں نوکر جیسا رہوا باہر سے دیکھا تو کوئی آدمی نظر آیا اس نے فوراً دروازہ بند کر لیا اگر عقل سے کام لیتے تو بول اٹھتے کہ میں مہمان ہوں بات ختم ہو جاتی مگر وہ تھے مولوی مقدس زبان سے کیوں بولتے۔ گرمی کے موسم رات وہاں تسبیح پڑھتے رہے۔ صبح کو نوکر نے اطلاع دی میں نے کہا تھانہ میں رپورٹ کرو بات کیتے ایک سب انسپکٹر مع دو کانسٹیبل کے آ گیا دروازہ کھلا تو مولانا برآمد ہوئے نوکر نے پہچان لیا اور مجھے اطلاع دی میں نے پولیس سے کہا تم لوگ جاؤ یہ اپنا ہی آدمی ہے تو کیا تم ایسا مولوی بننا چاہتے ہو۔ ہم ان کے سامنے کیا بولتے خموشی سے سنا اور سلام کر کے چلے آئے۔ والد مرحوم سے جب میں نے یہ واقعہ بیان کیا تو سخت مکدر ہوئے اور پھر عمر بھر مولانا سے نہ ملے۔

فاضل کے امتحان کے بعد میں نے منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

میری ملازمت کا آغاز

انسانی کردار کی داغ بیل تو بچپن ہی میں پڑنے لگتی ہے جس کی تعمیر اس ماحول سے ہوتی ہے جس میں اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ قلب کی پاک سطح پر یہ اولین نقش ہوتے ہیں جو ہلکے یا گہرے اس پر مرتسم ہوتے چلے جاتے

گر والدین صحیح وقت پر نگہداشت کرلیں تو آئندہ پختہ کردار بنانے میں بڑی مدد مل جاتی ہے۔ بلوغت کے بعد کردار کا رنگ نکھرتا ہے۔ تجربہ کا رہ نما ساتھ ہوتا ہے اور عقل اپنی روشنی میں ٹیڑھے سیدھے راستے کو بتاتی جاتی ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب کردار کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اور اخلاقی سطح کو ہموار کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس وقت کی غفلت حیات کی لذتیں خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہ ایک فطری اور نفسیاتی راز ہے کہ ہر انسان کسی کے کردار کو پیش نظر رکھ کر اپنا کردار بناتا ہے۔ یہ کوئی غیر یقینی اصول نہیں کہ کسی پر لاگو ہو اور کسی پر نہیں بلکہ زندگی کی اس موڑ سے ہر اس شخص کو گذرنا ناگزیر ہوتا ہے جو کسی تمدن یا معاشرت کا ممبر ہے۔

طالب علمی کا زمانہ زندگی کی آنے والی منزلوں کے متعلق تفصیل سے سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ تحصیل علم کا انہماک ایک محدود ماحول کے اندر صرف ان ہی باتوں کو سوچنے دیتا ہے جو اس مخصوص زندگی کے شایانِ شان ہوں۔ اس وقت جو کردار بنتا ہے اس لئے زیادہ استوار نہیں ہوتا۔ کہ وہ ایک محدود دائرہ کے اندر اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لیتا ہوا اس کے ارد گرد جو لوگ ہوتے ہیں۔ وہ خود اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں جس میں وہ خود ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

ہاں جب ان حدود سے باہر جب وہ کسی ایسی منزل پر آتا ہے جہاں اس کو مختلف راستوں کے راہ گیروں سے سابقہ پڑتا ہے اس وقت اس کو اپنے اور دوسروں کے کرداروں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور یہیں سے وہ اپنی ترقی کے اسباب پر ایک غائرانہ نظر ڈالتا ہوا اب یہ فیصلہ کرنا کسی قدر آسان ہو جاتا ہے کہ کون سی راہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دے گی۔ یہ انتخاب کوئی دوامی شے تو نہیں ہوتا کہ

ہٰذا لاہی نہ جائے بلکہ وقت وحالات کو دیکھ کر وہ حسب ضرورت تبدیلی کر سکتا ہے؟

میں نے سنہ ۱۹۱۲ء تک ایک علمی اور مذہبی ماحول میں اپنا وقت گزارا تھا۔ اس وقت میرا کردار وہی تھا جو ایک طالب علم کا ہوتا ہے۔ کسب معاش کے لئے اس وقت میرے سامنے دو ہی راستے تھے ایک پیش نمازی اور دوسرے انگریزی اسکولوں میں عربی فارسی اور اردو پڑھانا۔ پیش نمازی کے لئے تو میں نے اپنے کو اہل نہ سمجھا۔ اب رہا دوسرا سلسلہ بہت سے غور و تامل کے بعد اسی کو اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ عربی و فارسی کی اعلےٰ اسناد اچھی ڈویژن سے میرے پاس تھیں تو مجھے کسی اسکول میں جگہ مل جانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا دقت تو یہ تھی کہ درخواستیں انسپکٹروں کو انگریزی میں دینا ہوتی تھیں اور میں انگریزی سے قطعاً نابلد تھا میرے محلے میں بھی کوئی انگریزی داں سوائے سید محمد نبی ہادی صاحب کے نہ تھا وہ امروہہ کے ممتاز زرؤسا میں سے تھے جو بعد میں ایم ایل اے ہوئے خان بہادر ہوئے میونسپل بورڈ کے چیرمین ہوئے۔ میں ان کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھول سکتا کہ جب ان سے درخواست لکھنے کو کہا بے تامل لکھ دی اور اسناد کی نقلیں بھی کر دیں ضرورت پڑی تو میرے ساتھ مرادآباد جا کر سفارش بھی کرا دی حالانکہ میری اس وقت کوئی پوزیشن نہ تھی اس نیک سیرت انسان نے کبھی کوئی عذر نہ کیا۔ ان کی شرافت و ہمدردی کا یہ ایک نمایاں جوہر تھا۔ خدا ان کی روح پر اپنی رحمت نازل کرے۔

مجھے سب سے پہلے ایک عارضی ملازمت پر صرف ایک ماہ کے لئے

گورنمنٹ ہائی اسکول مرادآباد میں تیس روپے ماہوار پر ملی۔ اس زمانہ میں انگریزی تسلط اس حد تک تھا کہ اضلاع کے اکثر ہائی اسکولوں میں انگریز ہیڈ ماسٹر ہوتا تھا چنانچہ اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر بھی انگریز تھا۔ میں نے چارج تو لے لیا۔ لیکن یہ مہینہ میری زندگی کا ایک نازک ترین اور سخت پریشان کن دور تھا۔ اول تو ایک انگریز سے پہلا سابقہ اور میں انگریزی سے قطعاً نابلد۔ پھر انگریزی اسکول کے قواعد و ضوابط سے ناآشنا۔ پھر ہائی اسکول کے طلبا کو پڑھانا جن میں بعض مجھ سے عمر میں زیادہ تھے۔ پھر ایک ناتجربہ کار معلم کو دیکھ کر ان کی شرارتیں الغرض قلبی اضطراب کے ساتھ وہ تجربے ہوتے رہے جنھوں نے آگے چل کر میری رہ نمائی کی۔

ایک ماہ بعد یہ دور ختم ہوا اور چند ماہ بعد ہی مجھے شاہجہاں پور کے مشن ہائی اسکول میں چالیس روپیہ ماہوار پر ہیڈ مولوی کی جگہ مل گئی۔ اب مرادآباد کی سی الجھن یہاں نہ تھی۔ سابق تجربے شمع راہ بنے ہوئے تھے لیکن یہاں ایک وقت اور پیش آئی یہ ایک عیسائی ماحول تھا جس میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ بائبل کے ٹیچر پادری ہلی صاحب سے میری ان بن ہو گئی۔ پادری سن رسیدہ تھا اور میں نوجوان اس کے دل میں یہ ناپاک خواہش پیدا ہوئی کہ مجھے عیسائی بنائے وہ سمجھا تھا کہ میں اسلام سے ناواقف ہوں بہت جلد اس کے دام فریب میں آجاؤں گا چنانچہ اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ پہلے تو بڑے سبز باغ دکھائے۔ ایک خوب صورت لڑکی سے شادی ہوگی۔ بنگلہ رہنے کو ملے گا تنخواہ میں اضافہ ہوگا مشن سے الاؤنس ملے گا لیکن جب

انہیں پتہ چلا کہ یہ شکار پھنسنے والا نہیں تو معاندانہ روش اختیار کی اور اسلام پر اعتراضات کی بوچھار کرنے لگا۔ یہ گفتگو اس کے اور میرے خالی پیریڈ میں ٹیچر روم میں تقریباً روزانہ ہوتی تھی جب یہ صورت پیش آتی تو ملازمت سے قطعاً بے نیاز ہو کر میں کھلم کھلا اس کے مقابل آگیا اور ایسے دندان شکن جواب دیے کہ پادری بغلیں جھانکنے لگا میں نے عقیدۂ تثلیث کا ابطال بھی پوری قوت سے کیا پادری کو پتہ چلا کہ وہ کتنے گہرے پانی میں ہے۔

جب اس کو اپنی تمام کوششوں میں ناکامی نظر آئی تو اس نے امریکن مشنری سے جو اسکول کا مینیجر بھی تھا۔ میری شکایت کی کہ یہ شخص کٹر مسلمان اور بڑا متعصب ہے روزمرہ مجھ سے مناظرہ کرتا اور عیسائیت پر بھرپور ضربیں لگاتا ہے یہ سن کر وہ مجھ سے بدظن ہو گیا ایک دن مجھے بلا کر کہنے لگا اس بات کو یاد رکھئے اسکول میں مذہبی چھیڑ چھاڑ کی ممانعت ہے۔ اگر آئندہ آپ نے ایسا کیا تو میں آپ کی ملازمت ختم کر دوں گا میں نے کہا اس کی ابتدا پادری صاحب نے کی ہے۔ وہ مجھے کرسچین بنانا چاہتے تھے آپ ان کو روکئے۔

مختصر بات تو ختم ہو گئی مگر میں نے اس کے بعد وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور دوسری جگہ کی تلاش شروع کر دی۔

شاہجہاں پور کے زمانۂ قیام میں میری ملاقات مولانا سید فدا حسین صاحب قبلہ زیدپوری سے ہوئی جو گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے ایک سال تک ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہے بڑی خوبیوں کے انسان تھے عربی فارسی میں ٹھوس قابلیت رکھتے تھے نہایت خوش اخلاق ملنسار بلند کردار اور ہمدرد انسان تھے اور

نہایت ظریف الطبع۔ حقّے کے بڑے شوقین میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ یہ معلوم کر کے کہ مجھے ذوق شاعری کا ہے ایک دن کہنے لگے ایک دلچسپ نظم حقّہ پر لکھئے۔ چنانچہ یہ نظم میں نے لکھ کر سنائی تو بہت خوش ہوئے اور بڑی داد دی۔

حقّے کے فضائل

زمانہ میں مجھے دعویٰ نہ ہو کیونکر فضیلت کا
کہ ہر چھوٹا بڑا دم بھرتا ہے میری چاہت کا

مری طینت میں داخل ہو گئی ہے کچھ ایسی شانِ دلداری
کہ محفل میں ہوا کرتی ہے گھنٹوں نازبرداری

میں جس بزم اپنی دلسوزی کا قصہ لے کے آتا ہوں
نہ پوچھو کیسی آہوں کے دھوئیں منہ سے اڑاتا ہوں

وہ افسوں ہمدموں پر میں نے اپنے پھونک رکھا ہے
کہ میرا گڑگڑانا بھی انہیں اچھا ہی لگتا ہے

نہ تڑپے کیوں ہر اک شیدائی میرا داغِ فرقت میں
ہزاروں داغ دل پر کھا چکا ہے سوزِ الفت میں

بچا لیتا ہوں میں وحشت سے تنہائی میں انساں کو
مری صحبت سے ملتی ہیں فرحتیں ہر درویش و سلطاں کو

نگاہیں اس لئے مجھ پر پڑا کرتی ہیں محفل میں
کہ جگہ لیتا رہتا ہوں سدا احباب کے دل میں

نمایاں جب گزرتا ہو دورِ چرخِ مینائی
کھنچے آتے ہیں جانب میری صورت کے شیدائی

تواضع مجھ میں کوٹ دیتا ہے جب صانع بناتا ہے
میں جھکتا جاتا ہوں جتنا کوئی مجھ کو جھکاتا ہے

زمانہ وجد کرتا ہے مرے انداز و آئیں سے
جھلکتی ہے ساری بزم میری زلفِ مشکیں سے

دکھائے شان کیسی ہی کوئی محبوب فتنہ گر
جواب آتا نہیں زیبائی کی صادق ہے مثل مجھ پر

یگانہ ہوں زمانہ میں صفا گوئی سے نفرت ہے
مگر جتنا بھی گڑگڑاتا ہوں اتنی ہی عزت ہے

اسی سے بولتا ہوں میں جو مجھ کو منہ لگاتا ہے
چرا لیتا ہوں دم اس کا جو مجھ سے دم چراتا ہے

بہی دم سے دعویٰ ہے مجھ بھی کو ہم صفیری کا
مجھے رتبہ ملا ہے بادشاہوں کی وزیری کا

تصور سے دماغ انسان کا جب چرخ میں آتا ہے
مجھی کو بات کرنے کے لئے اس دم بلاتا ہے

ہوں میں جو منہ پہ بیٹھے دو چار میری بس سے تقریریں
اُمنڈتی پھر چلی آتی ہیں تو میری پہ تدبیریں

جفا میں دوستی میں اہل فنوں کی میں سنتا ہوں
پتنگ میں وہ تو بنتے ہیں میں لپٹی ان میں کھلتا ہوں

نہ کیا خام کاروں کو مری شیریں کلامی کو
بنا ہوں تم کہن میں طالب و عرفی و نظامی کا

محدث ہوں اصولی ہوں نجومی ہوں کہ شاعر ہوں
اطبا فلسفی ہوں یا کہ علم دین کے ماہر ہوں

کیا فن میں غرض ان سب کی بندہ کا گزارا ہے
بوقت خامہ فرسائی اسی دم کا سہارا ہے

بوقت گفتگو تیزی ذرا گر مجھ میں آ جائے
حریفوں کے اسی دم کھلبلی بیٹھوں میں پڑ جائے

وہ شیریں لب سدا عشاق جن پر جان دیتے ہیں
مری کب بات ان بوستان کی ہونٹوں کے لیتے ہیں

مسیحائی کا گر میں دم بھروں تو مجھ کو زیبا ہے
کہ میرے دم کے صدقہ میں یہ شیدائی جیتا ہے

مجھے مت میری دوری میں بتے پوچھو تو رونق ہو
بدوں میرے قدم رنجہ کے محفل کا منہ فق ہے

بزرگی خاندانی مجھ سے ہے یاروں کو حاصل ہے
کوئی تو بات ہے آخر جو تے لوگ مائل ہیں

جو عاشق میرے سچے قدر ہیں جو دل سے پیار کرتے ہیں
سفر میں اور حضر میں وہ برابر ساتھ رکھتے ہیں

سبق میں خود کشی کا دل بھی اس میں یاد کرتا ہوں
جلا کر اپنے دل کو دوستوں کو شاد کرتا ہوں

نہ پوچھو کوئی جب سے دل آتش کی حالت کو
بیاں کرتا نہیں زردوں کی خود مصیبت کو

مرے قلب و جگر جب تک نہیں ہوتے جل جل کر
اثر ہوتا نہیں یاران پختہ کار کے دل پر

ظفر دیکھے تو جانے ہو طوالت پر نظر بھی ہے
سنا کر سر ختم حقہ ہو گیا تم کو خبر بھی ہے

ملازمت کا دوسرا دور

جولائی سنہ ۱۹۱۳ء سے کانپور میں ایک نیا اسکول تھیوسوفیکل اسکول کے نام سے کھلنے والا تھا میں نے درخواست دی اور بحیثیت ہیڈ مولوی کے میرا تقرر پچاس روپیہ ماہوار پر ہوگیا ۔ ۳ جولائی کو مجھے وہاں پہنچنا تھا مگر دقت یہ پیش آئی کہ کانپور میں میرا جاننے والا کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے گھر جا کر ٹھہر سکوں ۔ سید ضیا احمد میرے خالہ زاد بھائی وہاں ڈاکخانہ میں کلرک تھے مگر مجھے ان کا اول تو پورا پتہ معلوم نہ تھا دوسرے اگر ہوتا بھی تو کانپور جیسے شہر میں تلاش کرنا مشکل تھا ۔ بہرحال توکل بخدا روانہ ہوگیا جب لکھنؤ سے کانپور کے لئے گاڑی بدلی تو لکھنؤ کے ایک صاحب میرے ہم سفر ہوگئے اثنائے گفتگو میں میں نے اپنی پریشانی ان سے بیان کی انھوں نے کہا آپ اسٹیشن سے سیدھے پٹکاپور جائیں اور تانگہ والے سے کہیں چھتہ دیوان ناصر علی پہنچا دے ۔ یہ ایک شیعی محلہ ہے وہاں مولانا سید حسین صاحب قبلہ مجتہد رہتے ہیں اور وہاں کے امام جمعہ و جماعت ہیں ان سے آپ کی مشکل حل ہوجائے گی ۔

چنانچہ جب میں وہاں پہنچا جمعہ کا دن تھا نماز جمعہ اسی عمارت ہوتی تھی مولانا نماز کی تیاری میں مصروف تھے بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور ازراہ ہمدردی فرمایا آپ یہاں ٹھہریں بعد فراغ نماز میں آپ کو سید ضیا احمد تک پہنچوا دوں گا ۔ میں خدا کا شکر بجا لایا کہ یہ مشکل آسان ہوئی ۔ نماز سے فراغت کے بعد مولانا سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی انہوں نے فرمایا ضیا احمد صاحب کے پاس ایک چھوٹا سا مکان ہے آپ کا قیام نہ تو وہاں مناسب ہوگا اور نہ وہ آپ کو جگہ دے سکیں گے بہتر یہ ہے کہ آپ میرے

پاس رہیں ایک کمرہ میں آپ کے لئے خالی کرائے دیتا ہوں چنانچہ اسی روز ایک خاصہ
بڑا کمرہ مجھے رہنے کو مل گیا۔

اس کمرہ میں میں سات سال رہا یعنی قیام کانپور کی کل مدت اگر یہ بندوبست
نہ ہوتا تو میرے لئے بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا کیوں کہ اول تو کرایہ پر کانپور میں
کسی شیعی ماحول کے اندر ملنا مشکل تھا اور اگر ملتا تو اتنے کرایہ کا جسے میں برداشت
نہ کر سکتا پھر بھی تنہائی کا سوال باقی رہتا۔

دیوان ناصر علی صاحب جو پٹنہ کے رہنے والے اور سلطنت اودھ میں اعلےٰ
منصب پر فائز تھے ان کی جاگیر ضلع کانپور میں تھی۔ یہ عالی شان عمارت ان ہی کی بنوائی
ہوئی تھی۔ ایک بہت لمبا چوڑا شہ نشین تھا جو ایک راستے کو پاٹ کر بنایا گیا تھا اسی
نے چھتے کے نام سے موسوم ہوا شہ نشین کے بعد ایک وسیع دالان تھا اور اس کے
دونوں طرف دو کمرے تھے دالان کے بعد ایک حوض وسط میں تھا اس کے بعد صحن
تھا اور صحن کے مغربی سمت میری رہائش کا کمرہ تھا۔ یہ سب عمارت جناب مولانا سید
حسین کے چارج میں تھی اس تمام جائداد کے مالک نواب عباس علی اور نواب مبارک
علی تھے جو پٹنہ میں رہتے تھے اور ان کا اسسٹنٹ منیجر یہاں رہتا تھا۔

کانپور کسی زمانہ میں سلطنت اودھ کا جیل خانہ سمجھا جاتا۔ بادشاہوں کے معتوب
یہاں بھیجے جاتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں کانپور کی برسات
کی جو نقشہ کشی کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے گلی کوچے کیسے غلیظ ہو گئے۔
سرور کے چند فقرے یہ ہیں۔

ذکر کانپور کی برسات ہیہات۔ اگر خواب میں کہیں

نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے۔ اس موسم میں دو آدمی
ایک جگہ نظر نہ آئے مگر چپکے کے پھنسے۔

دیکھی ہے یہ ریت اس نگر میں جو تا ہے گلی میں آپ گھر میں

اسی زمانے میں جناب مفتی سید محمد صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کا قیام ابھی کچھ عرصہ کانپور میں رہا تھا یہاں مول گنج ایک بازار ہے جہاں رنڈیاں رہا کرتی تھیں۔ جناب مفتی صاحب موسم برسات میں ایک روز اسی بازار کی طرف سے گذرے۔ ایک رنڈی کے کوٹھے کے نیچے ایسی کیچڑ تھی کہ قبلہ و کعبہ کا پیر پھسل گیا۔ برجستہ فرمایا ؎

کس قدر کوچۂ جاناں کی ہے رنگین مٹی قدمِ زاہد صد سالہ پھسل جاتا ہے

جس زمانہ میں میں وہاں تھا امپرومنٹ ٹرسٹ نے بہت کچھ حالت درست کردی تھی تاہم کچے گلی کوچوں میں کیچڑ کا وہی عالم تھا بہت سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔

چند ہی روز کے بعد میں وہاں کے مومنین سے گھل مل گیا اور ایسا کہ پردیس دیس معلوم ہونے لگا اور پُر لطف صحبتیں گرم ہونے لگیں چار صاحبان تو ایسے تھے جو تقریباً ہر روز ایک جگہ مل کر بیٹھتے تھے۔ سید محمد مہدی صاحب عرف سید جان صاحب۔ سید محمد کاظم صاحب عرف بتن صاحب۔ سید وارث حسین صاحب عرف بنے صاحب اور سید لشکر حسین صاحب زیدی۔ افسوس کہ یہ سب راہی جنت ہوگئے۔ ۔ ے میں تنہا پس کارواں رہ گیا۔

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمر دراز
سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا

برسوں یہ معمول رہا کہ ہم پانچوں ہر اتوار کو ایک جگہ کھانا کھاتے تھے۔ باری باری ایسا ہوتا نہایت مخلصانہ اور مہذب صحبتیں تھیں۔ بہت سے لوگوں نے اِس مختصر انجمن میں شرکت چاہی مگر اس کے دائرہ کو وسعت دینا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا۔

مولانا سید حسین صاحب قبلہ کا زنانہ مکان چھتہ کے باہر قریب ہی تھا۔ مگر ان کا مطب چھتہ ہی میں تھا۔ صبح و شام ان کی نشست یہیں دالان میں تخت پر رہتی تھی پانچوں وقت کی نماز یہیں پڑھتے تھے بڑے خلیق۔ مہمان نواز اور ہمدرد قوم تھے۔ ظریف الطبع بھی تھے۔ حقہ بہت پیتے تھے کسی وقت چلم ٹھنڈی ہوتی نہ تھی بڑے آدمی تھے۔ مگر ہمت کے جوان ان سے روزانہ علمی گفتگو ہوتی رہتی۔ ان کے صاحبزادے کان پور والی بی بی سے اس وقت بچے تھے اب بحمد اللہ جوان ہیں بلکہ صاحب علم و فضل ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں شیعہ دینیات پڑھاتے ہیں۔ مولوی سید اصغر حسن نام ہے۔

یہ واضح کر دوں کہ مجھے خشک زندگی کبھی پسند نہیں آئی جہاں رہا اپنے تعلقات بڑھانے اور ہمنشین سے مل کر رہنے کی کوشش کی۔ غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے تک پہنچا تھا کہ جو لوگ دماغی کام کرتے ہیں ان کو تفریح کے سامان مہیا کرنا ضروری ہیں ورنہ ان کی صحت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتی اور دماغی امراض کا جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ میری سوسائٹی کے تمام ممبر تعلیم یافتہ۔ خوش فہم و خوش فکر زندہ دل اور مذہبی امور سے پوری دلچسپی رکھنے والے تھے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ شیعہ بچوں کے لئے کوئی دینی مدرسہ نہیں ہے میں نے تحریک کی کہ انجمن بنا کر مدرسہ کھولا جائے ابتدائی درجات سے ترقی دے کر مڈل اسکول

بھگ سے جایا جائے چنانچہ شیعہ سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن بنی اور حکیم صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں مدرسہ کھولا گیا اور اس کی نگرانی میری سپرد ہوئی چار مدرس تعلیم دیتے تھے صرف چندہ پر اس کی بقا کا دارومدار تھا۔ چند سال تو چلا اس کے بعد بند ہوگیا یہی سوسائٹی ٹپکا پور کی مسجد میں بجماعت نماز اور دیگر مذہبی خدمات کے لئے ایک پیش نماز بھی رکھتی تھی۔

میری ذاکری کا آغاز

کسی نے صحیح کہا ہے:۔ شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست۔

مجھے اپنی زندگی میں اس کے متعلق بہت سے تجربے ہوئے کہ شوق خود ایک بڑا رہنما ہو وہ بند راستے خود کھولتا جاتا ہے۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ اگر شوق صادق ہے تو خدا کی توفیق بھی شامل حال ہوتی ہے وہ اپنی قدرت سے سامان مہیا کرتا ہے۔ کانپور آنے سے پہلے ذاکری کا مجھ سے تعلق نہ تھا اور نہ اس طرف کوئی رغبت تھی۔ مگر اتفاقاً ایک سبب پیدا ہوگیا مجھے کانپور میں آئے شاید دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک بندہ مومن محمد اسمٰعیل نامے جو محلہ کرسواں میں رہتے تھے۔ اور کسی مل میں ملازم تھے لاولد تھے اور مجالس کرنے کے بڑے شوقین تھے۔ ہر شب جمعہ میں مجالس کیا کرتے تھے اور کسی ذاکر کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک روز میرے پاس آئے اور مجلس پڑھنے کی خواہش کی میں نے کہا۔ میں مجلس پڑھنی نہیں جانتا۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ برابر اصرار کرتے رہے۔ عذر کے جتنے

پہلو تھے میں نے ان کے سامنے رکھے مگر اس بندہ خدا نے ایک نہ سنی۔ وہ اس
عقیدے کے آدمی تھے کہ ہر مولوی ... واعظ ذاکر سب کچھ ہوتا ہے۔ جب
وہ کسی طرح نہ مانے تو میں خاموش ہو گیا انہوں نے میری خاموشی کو رضامندی
سمجھا اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے بس حضور میں اعلان کرتا ہوں وہ تو یہ کہہ کر
چل دیئے۔ یہاں خیالات کے دورے پڑنے لگے کیسے پڑھوں گا۔ خدا جانے مجلس
میں کتنے لوگ ہوں گے کیسی بدنامی ہوگی جب مجلس ناکامیاب رہے گی۔ میرے
پاس تو مقتل کی کوئی کتاب بھی نہیں مجلس میں جو چار روز باقی تھے وہ اسی خبط
میں گزرتے رہے۔ آخر ایک صاحب سے کتاب خلاصۃ المصائب مستعار لی اور
ایک مختصر سی مجلس کو رٹنا شروع کیا۔ مگر حافظہ گھبرایا ہوا قوت غور و فکر کے ہاتھ
پاؤں۔ ڈھیلے یاد کرتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ رٹے ہوئے الفاظ زبان کا ساتھ
نہیں دیتے۔ آواز تنہائی میں بولتے وقت اپنا زور نہیں دکھاتی۔ اسی اضطراب
میں جمعرات آگئی اور بعد نماز مغربین اسمعیل دل کی دھڑکن کا فرشتہ بن کر آگئے۔
چلیے سرکار۔ بسم اللہ کہہ کر اٹھ تو کھڑے ہوئے۔ مگر چلا کس سے جائے خدا خدا کرکے
دل و دماغ کو سنبھالے ہوئے اسمعیل کے مکان پہنچے اندر جا کر دیکھا تو سارا مکان
مومنین سے بھرا ہوا ہے۔ خدا جانے کن الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ اتنے لوگ کھنچ
آئے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی درود کے نعرے بلند ہوئے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے
ہوئے تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کوئی بڑے نامور ذاکر ہیں۔ اگرچہ نوجوان
ہیں مگر علم کا سمندر معلوم ہوتے ہیں۔

ذرا بیٹھے تھے کہ اسمعیل صاحب نے ہاتھ جوڑ کر قبلہ و کعبہ بسم اللہ۔ ان

الفاظ نے دل کے اضطراب پر ایک تازیانہ مارا۔ بمشکل تھرتھراتے کانپتے منبر پر گئے۔ اب بولے کون۔ ذرا دیر خاموش رہے تو سامعین نے درود کے نعرے بلند کیے۔ میں بولنا چاہتا تھا مگر الفاظ میں گرفت میں نہیں آتے تھے۔ المختصر جوڑ کر آئے تھے انہیں بولنا شروع کیا۔ تک بے تک مجلس میں نہ آہ ہے نہ واہ۔ آخر سامعین سے یہ کہہ کر معذرت خواہ ہوا۔ حضرات! میں تازہ گرفتاروں میں ہوں۔ مجھے مجلس پڑھنا نہیں آتا۔ میاں اسمٰعیل کے اصرار پر اتفاقاً چلا آیا ہوں۔ یہ کہہ کر منبر سے اُتر آیا۔ ملامت کا پسینہ ماتھے سے ٹپک رہا تھا بوقت واپسی یہ خیال لے کر لیٹا۔ اگر یہاں عزت سے رہنا ہے تو فن خطابت میں کوشش کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالےٰ نے ارادہ میں برکت دی ہے اور کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی۔ اسی روز سے اس دھن میں پڑ گئے۔ مشق کے لئے اسمٰعیل کی مجالس تھیں۔ ایک ماہ کی محنت شاقہ کرنے کے بعد اسمٰعیل سے کہا کہ اب ہر جمعرات کو میں تمہارے یہاں پڑھا کروں گا۔

بحمد اللہ علم تو تھا محنت کے بعد دماغی صلاحیتیں ابھار اکھا گئیں اور صرف چھ ماہ کے بعد اس منزل پر آ گئے کہ مختلف محلوں کے لوگ اپنی مجلسوں کے لئے مدعو کرنے لگے۔ محرم آ گیا تو ایک عشرہ میں ۲۰۵ مجلسیں پڑھیں۔ لیکن آدھ گھنٹے زیادہ نہیں کچھ فضائل کچھ مصائب۔ بہرحال اس عشرہ میں ہمارا شمار اچھے قسم کے ذاکروں میں ہونے لگا۔

جون پور کا محرم

جون پور کے ایک صاحب غلام حسین نامی کسی ضرورت سے کانپور آئے تھے۔ انہوں نے کہیں میری ایک مجلس سن کر پسند کی۔ اگلے محرم کی پانچ مجلسوں کے لئے مجھے مدعو کیا۔ شہرت کے شوق اور نامور بننے کے خبط نے یہ دعوت قبول کرلی۔ محرم کی چاند رات کو میں جونپور پہنچ گیا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ نہ کرنے سے ندامت و خجالت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کانپور میں جو فوقیت حاصل ہوئی تھی وہ محض اس وجہ سے کہ مقامی مجالس خوانوں میں کوئی ذاکر اعلےٰ طبقہ کا نہ تھا ؎

ہم ہی تھے تری محفل میں کوئی اور نہ تھا

جونپور پہنچے تو پتہ چلا کہ لکھنؤ کے کئی کہنہ مشقوں کا مقابلہ ہے پانچ دن پریشانی سے گزرے اس کمی کو پورا کرنا وقتی طور پر ناممکن تھا تاہم پوری قوت سے کام لیا گیا خدا کا شکر ہے کہ ٹوپی سر پر رہ گئی۔ کسی نے اچھا نہ کہا تو بُرا بھی نہ کہا۔

چند سال بعد وہ زمانہ بھی آیا کہ اسی جونپور میں ایسی معرکۃ الآرا مجالس پڑھیں کہ ہر طرف سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہوئی۔ محلہ بلوہ گھاٹ میں مقبول منزل میں جو تین دن سالانہ مجالس ہوتیں ہر سال ایک مجلس پڑھنے کئی سال تک مرادآباد سے میں بھی جاتا رہا۔

جونپور کی مولیاں

جب پہلے سال میں جونپور میں مجلس پڑھنے گیا تو بانی مجالس شیخ بشیر احمد صاحب نے جو تاجر عطر و تیل تھے وقت رخصت جہاں تیل اور عطر کے تحفے دئے۔ ایک چھابہ میں پانچ مولیاں بھی پیش کیں جن سے کوئی دس بارہ سیر سے کم نہ تھی۔ یہ خاص جونپور ہی کی پیداوار تھی ان کی جسامت دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اتنی موٹی مولی آج تک نہ دیکھی تھی ان کا اچار بڑا لذیذ ہوتا تھا۔

جب ریل میں سوار ہوئے تو مولیوں کا چھابہ قلی نے اوپر کے برتھ پر رکھ دیا۔ اس ڈبے میں ایک ہندو جنٹل مین جو کسی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر تھے کہیں سے آرہے تھے وہ اور میں دو ہی آدمی اس ڈبے میں تھے وہ مولیوں کو بہت گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجھ سے کہنے لگے کیوں جناب یہ کیا چیز ہے۔ میں نے از راہ ظرافت کہا یہ ہاتھی دانت ہیں وہ بولے یہ کہاں سے آپ نے خریدے میں نے کہا راجہ صاحب جونپور نے بہت سے ہاتھی پال رکھے ہیں وہ ان کے دانت نکلوا کر فروخت کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ آپ ہر بات سن ہی لیں انہوں نے کہا یہ کس قیمت کے ہیں میں نے کہا کوئی چالیس کا ہے کوئی پچاس کا۔ انہوں نے کہا آپ ان کا کیا کریں گے میں نے کہا ان پر چاندی کی شام میں جڑوا کر دیواروں پر لگواؤں گا وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ جناب یہ کیا شوق ہے میں نے کہا دنیا میں انسانوں کو مختلف

قسم کے شوق ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے جب سوالات کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا تو میں اٹھا اور ایک مولی لا کر ان کی دونوں رانوں پر رکھ کر کہا کہ یہ آپ کی نذر ہے وہ گھبرا کر کہنے لگے جی مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب جو انہوں نے غور سے دیکھا تو کہنے لگے یہ تو مولی سے مشابہ ہے میں نے کہا میں نے تو آپ کی رانوں پر ہاتھی دانت ہی رکھا تھا اب جو کچھ ہو جائے اس کے بعد ان کو بتایا گیا اور وہ مولی میں نے ان ہی کی نذر کر دی۔

مجھے ایک ضرورت سے لکھنؤ جانا تھا جب مدرسۂ ناظمیہ پہنچا تو وہاں لڑکوں نے سوالات کی بھرمار کر دی ایک مولی ان کو دے کر کہا آپ لوگ اس پر غور کئے جائیں۔ جب مراد آباد جانے کے لئے اسٹیشن پر آیا تو گاڑی آنے میں دیر تھی میں جا کر بیٹھ گیا۔ اب جو مسافر آیا اس نے سوالات کرنے شروع کر دئے۔ دق ہو کر مولیوں پر کمبل ڈال دیا۔

ریل میں سوار ہوئے تو پھر وہی آفت در پیش تھی ایک صاحب بریلی جانے والے پستہ قد بار بار دیکھ رہے تھے اور مجھ سے سوالات کئے جاتے تھے میں نے جان بچانے کو یہ کہہ دیا مجھے معلوم نہیں کیا ہے۔ ان سے ضبط نہ ہوا اور کھڑے ہو کر جواب اتارنا چاہا ایک مولی پھسلی نیچے ایک صاحب گہری نیند سو رہے تھے وہ مولی دھم سے ان کے منہ پر گری وہ چیخ اٹھے ابے تو نے کیا مارا۔ مولی لڑھک کر برتھ کے نیچے گئے۔ اب نہ مارنے کو خبر کیا مارا نہ مضروب کو خبر کہ کیا چیز آ کر گری۔

دونوں میں دیر تک مار کٹائی ہوتی رہی آخر مسافروں نے دونوں کو جدا کیا اب ہر ایک یہ سوال کرتا تھا یہ ہے کیا۔ جب میں نے بتایا تو سب نے تعجب کیا۔ ایک

مولی میں نے بریلی جانے والے کو دیدی کیونکہ وہ پہنچا گیا تھا۔ دو مولیاں لے کر گھر آیا۔ اچار ڈالا تو واقعی بڑے ذائقہ کا تھا۔ افسوس یہ نعمت اس بے دردی سے کیوں لٹا دی۔ پھر اس موسم میں جونپور جانا نصیب نہ ہوا۔

ایک عجیب واقعہ

ضلع کرنال کے ایک صاحب کانپور کی کلکٹری میں ملازم تھے۔ بڑی عسرت میں بسر ہوتی تھی چونکہ بندۂ مومن تھے میری ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں ایک سید نے جنہوں نے کہا میرے ساتھ میری ایک بیوہ بہن بھی ہے جس کے دو بچے ہیں۔ اسے اپنا دردِ دل لوگوں سے زبانی کہتے شرم آتی ہے اگر آپ چند شعر بیوہ کی فریاد کے عنوان سے لکھ دیں تو وہ امراء کے یہاں جا کر پیش کر دیا کرے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن جلد پورا نہ کر سکا اتفاقاً سید صاحب کا انتقال ہو گیا اب ایک گھر میں دو بیوائیں۔ اور چار یتیم بچے ہو گئے ایک دن وہ دونوں میرے پاس آ کر رونے لگیں اور میرا وعدہ یاد دلایا میرے دل پر سخت چوٹ لگی اسی دن ذیل کی نظم لکھ کر بھجوا دی۔ اس نظم نے اہلِ دل حضرات کے دلوں کو گرما دیا اور بہت جلد ان کے آزوقہ کا معقول انتظام ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذرا سی دماغی کاوش سے ان مصیبت زدوں کے سر سے آئی بلا ٹل گئی

بیوہ کی فریاد

میرے مولا مری بگڑی کے بنانے والے
اے مرے سوزِ دروں کے مٹانے والے

جز ترے حالِ دلِ زار سناؤں کس کو
سوزشِ داغِ جگر جا کے دکھاؤں کس کو

پھونکا ہے آتشِ غم نے دلِ مضطر میرا
راہ گم کردہ ہوں کوئی نہیں رہبر میرا

صبح سے شام مجھے ہوتی ہے روتے روتے
راتیں کٹ جاتی ہیں منھ اشکوں سے دھوتے دھوتے

درد رگ رگ میں ہے لیکن کوئی درماں ہی نہیں
جان بچنے کا بظاہر کوئی ساماں ہی نہیں

ہو شفا خاک مرض سے جو مداوا نہ رہے
کیا وہ بیمار بچے جس کا مسیحا نہ رہے

کون طوفاں میں خبر ہے مری لینے والا
چھٹ گیا مجھ سے مری ناؤ کا کھینے والا

ٹوٹی کشتی مری اور پاس کنارہ نہ رہا
ڈوبتے بیڑے کو تنکے کا سہارا نہ رہا

ہائے کوئی نہیں امداد کو آنے والا
ڈوبا پہلے ہی مرا پار لگانے والا

جو گزرتی ہے کسے جا کے سناؤں یارب
کس کو زخمِ دلِ صد چاک دکھاؤں ہائے

میری صورت سے عیاں دردِ نہاں ہوتا ہے؟
وہ خلش ہے کہ ہر اک موئے بدن روتا ہے

تیرہ بختی سے مرا رشتۂ جاں ٹوٹ گیا
ہاتھ میں ہاتھ تھا جس کے وہ مجھ سے چھوٹ گیا

کون اب میری مدارات ہے کرنے والا
لے گیا ساتھ مرے عیش کو مرنے والا

زور سے خواہشِ دل کس کو جتا سکتی ہوں
بے تکلف کسے ہر بات بتا سکتی ہوں

سر کو زانو پہ رکھے آہ و بکا کرتی ہوں
اک کہانی دلِ پُر غم سے کہا کرتی ہوں

کوئی ساماں نہیں دل کے بہلنے کے لئے
سینکڑوں دل میں ہیں ارماں نکلنے کے لئے

صاحبِ اوج کا یارب نہ گرانا پایہ
سر سے زوجہ کے نہ شوہر کا اٹھانا سایہ

کیا مزا زیست کا جب کوئی پرستار نہ ہو
گھر وہ ہے قبر سے بدتر جہاں غمخوار نہ ہو

بھیک کے ٹکڑوں پہ اب زیست بسر ہوتی ہے
تارے گن گن کے شبِ غم کی سحر ہوتی ہے

چکیاں پیس کے کرتی ہوں گزارا اپنا
کیا کروں جب نہ رہا کوئی سہارا اپنا

حالِ دل غیر سے کہتے ہوئے شرماتی ہوں　　آگ سینے میں لگی ہے میں جلی جاتی ہوں

ہو چکے جو مری قسمت میں تھے ہونا باقی
ایک دم اب نہیں جینے کی تمنا باقی

امروہہ میں نئی مجالس خوانی

کانپور میں میرے ساتھ امروہہ کے دو شخص اور بھی رہتے تھے ایک میرے عزیز مولوی ولی حیدر سلمہٗ جو سناتن دھرم ہائی اسکول میں پرشین ٹیچر تھے۔ اور اب خانیوال ضلع ملتان میں بحیثیت پیش نماز اور واعظ کے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے سید محمد رضا صاحب عرف جھمّا ساکن محلہ جعفری عرف بچو کا جو سنگر کمپنی میں ملازم تھے۔

۱۹۱۸ء سے پہلے امروہہ میں میری کوئی شہرت نہ تھی کیونکہ طالب علمی کے بعد زیادہ تر باہر رہا اور کوئی وصف بھی ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے شہرت ہوتی لیکن قدرت جب کسی کو ابھارنا چاہتی ہے تو اس کے اسباب خود بخود فراہم ہونے لگتے ہیں محمد رضا صاحب کے محلہ میں یکم صفر سے ۸ صفر تک عزاخانہ میں مجالس ہوا کرتی تھیں۔ جب کانپور میں انہوں نے متعدد مجلسوں میں میرے بیانات سنے۔ اور میری طرف رجوع تمام دیکھی تو مجھ سے اپنے یہاں کے عشرہ میں پڑھنے کی خواہش کی میں نے عذر کیا مگر وہ نہ مانے۔

یہ عشرہ میں نے دس سال بغیر کسی معاوضے کے صرف کرایہ پر اکتفا کر کے پڑھا بعض سالوں میں وہ بھی نہ ملا۔ مگر میں نے ان لوگوں کی مجبوریوں پر نظر رکھ کر پڑھنا ترک نہ کیا حالاں کہ روزمرہ آیا دستہ تنے جانے میں مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔

ان مجالس میں مجمع کم ہوا کرتا تھا لیکن جب سے میں نے یہ سلسلہ شروع کیا ہر سال مجمع بڑھتا ہی چلا گیا ان مجالس کی وجہ سے شہر میں میری کافی شہرت ہو گئی اور ادنیٰ و اعلیٰ کی نظروں میں وقار بڑھ گیا۔

ایک خاص مجلس

کانپور میں سلاطین اودھ کے ورثہ داروں میں نوابوں کے دو خاندان تھے جو گورنمنٹ برطانیہ سے وثیقہ پاتے تھے۔ ایک خاندان گوال ٹولی میں آباد تھا۔ اور دوسرا پٹکاپور میں اس خاندان کے راس و رئیس نواب مظفر حسین خان صاحب اور اور المومنین تھے یہ کتاب چار جلدوں میں نہایت جلی قلم سے لکھی ہوئی تھی چھپی تھی اور مفت تقسیم ہوئی تھی۔

نواب صاحب جو بڑے حضور یا منجھلے آغا کے نام سے مشہور تھے بڑے نیکدل سخاوت پسند اور شاہی آن بان کے آدمی تھے۔ عالی شان محل سرا کے سامنے ایک پائیں باغ تھا۔ اسی میں محل سرا کے دروازے کے سامنے نواب صاحب کی نشست کا کمرہ تھا۔ ۸۔۹ بجے صبح محل سرا سے برآمد ہوتے تھے۔ تین چار مصاحب

پہلے سے موجود ہوتے تھے جو شہر کی خبریں سناتے تھے۔ کانپور میں میرے قیام کو کئی سال گزر چکے تھے ایک روز مولانا سید حسین صاحب جو بحیثیت ایک طبیب کے نواب صاحب کے مصاحبین میں تھے مجھ سے فرمانے لگے۔ آپ آج تک نواب صاحب سے نہیں ملے چلئے آج ان سے ملاقات کرا دوں میں نے کہا جناب مولانا! میں ایک غریب آدمی ہوں مجھے نوابوں کے درباروں میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مجھ سے وہاں کے رسوم وآداب کی پابندی نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا میرے جانے سے ان کو تکدر اور مجھے دل گرفتگی ہوگی۔

جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں ساتھ ہو لیا اور کمرہ میں مصاحبین کے ساتھ دو زانو بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نواب صاحب تشریف لائے تو سب تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ نوکر پیچھے پیچھے پیچوان لے کر آیا۔ اور ایک ماما پانوں کا خاصدان لائی۔ نواب صاحب نے ایک نظر میرے اوپر ڈالی مولانا نے مبالغہ آمیز الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔

نواب صاحب نیچی نظریں کئے بیٹھے تھے اور پیچوان خوشبو کی لپٹیں اڑا رہا تھا مگر نواب صاحب کا حقہ تو اچھا تھا پیکوں میں حقے کا ہمیشہ سے رسیا ہوں بہترین خمیرے کی خوشبو مجھے بے چین کر رہی تھی جب ضبط نہ ہو سکا تو میں نے اس پیچے کی شاخ ہاتھ میں لے کر پینا چاہا مولانا نے چٹکی ماری اور روکنا چاہا۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور پینا شروع کر دیا۔

نواب صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا اور خاموش ہو رہے کچھ دیر خوشنویسوں اپنی اپنی اطلاعات بتائیں جن میں اکثر من گھڑت تھیں۔

جب یہ صحبت برخاست ہوئی اور ہم باہر نکلے تو مولانا نے کہا آپ نے یہ بے جا حرکت کی میں نے کہا قبلہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آداب شاہی سے واقف نہیں اگر یہ کوئی گناہ کبیرہ تھا تو چلیں کر مجھ پر حد شرعی جاری کر دیجیے۔ اگر نواب صاحب میری اس گستاخی کا ذکر آپ سے کریں تو آپ کہہ دیں دیہاتی قصبی ہے شاہی مجلسوں کے آداب سے واقف نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس دودمان عالی سے نادار مومنین کی بڑی امداد ہوتی اور شیعیان کانپور کو اس خاندان کی وجہ سے بڑی تقویت تھی۔

ان ہی نواب صاحب کے عزا خانہ میں جو محل سرا کے اندر تھا اور بڑا شاندار عزا خانہ تھا۔ عشرہ محرم میں مجالس ہوتی تھیں جن میں معروف مرثیہ خوان پڑھا کرتے تھے۔ مجلس کی شان یہ ہوتی تھی کہ بہت طویل و عریض شاہ نشین کے نیچے جو بہت لمبا چوڑا دالان تھا اس میں ایک بہت بلند شاندار منبر رکھا رہتا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر نواب صاحب تشریف فرما ہوتے ان کے سامنے نصف دائرہ بنا کر اس خاندان والے اور نوابین گوال ٹولی تشریف فرما ہوتے تھے۔ بعد کے نصف حصہ میں مومنین کو جگہ ملتی تھی۔ چونکہ نشست بے قاعدہ تھی۔ اس لئے نہ آہ ہوتی تھی نہ واہ۔

آٹھویں محرم کی مجلس میں مجمع بہت زیادہ ہوتا تھا کیونکہ اس مجلس میں شیرمال تقسیم ہوتے تھے ایک سال یہ مجلس پڑھنے کی مجھ سے خواہش کی گئی۔ مجھے اس دعوت کو قبول کرنے میں اس لئے تامل تھا کہ مجلس کی مذکورۂ بالا نشست کی صورت میں مجھے زیادہ کامیابی نظر نہ آتی تھی مگر مولانا سید حسین صاحب کے حکم کی تعمیل میں

منظور کرلی۔ میں نے مستحکم ارادہ کرلیا کہ اس نشست کو بدلنا ضروری ہے چنانچہ منبر پر جا کر میں نے مجمع سے کہا آپ لوگ منبر سے بہت دور بیٹھے ہیں شاید میری آواز آپ تک نہ پہنچے۔ (اس وقت لاؤڈ اسپیکر کا رواج نہ تھا۔) میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ آگے تشریف لے آئیں یہ مجلس حسین ہے یہاں امیر و غریب سب برابر ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جناب نواب صاحب کو یہ بات ناگوار نہ ہوگی مجمع تو یہ چاہتا تھا میرے کہتے ہی سب اٹھ کر آگے آگئے۔ بحمداللہ مجلس خوب ہوئی۔

بعد مجلس لوگوں نے میری اس جرأت کی داد دی۔ دوسرے روز مولانا سید حسین صاحب ۲۰۵ روپے لے کر آئے (اس زمانہ میں یہ اعزازی رقم تھی) کہ یہ نواب صاحب نے بھیجے ہیں میں نے کہا مولانا میں یہ رقم نہ لوں گا۔ انہوں نے بہت کچھ سمجھایا مگر میں نے نہ لے اور ان سے کہا آپ میری بات ہلکی نہ کرائیے۔ مولانا واپس لے گئے اس کا نتیجہ اچھا ہوا۔ ان حضرات کے دل میں میری وقعت بہت زیادہ ہوگئی۔ اس کے بعد کئی سال تک میں ان کے یہاں سوئم کی مجلس پڑھتا رہا۔ کانپور سے چلے آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا دو سو روپیہ اس مجلس کا نذرانہ دیتے رہے۔

کانپور میں حاجی سید محمد اسمٰعیل صاحب کانپور کے ممتاز رؤسا میں سے تھے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ میرے مخلص دوست سید محمد مہدی صاحب کے منجھلے بھائی تھے ان سے میرے تعلقات برادرانہ تھے۔ جیہم میں ان کے عزا خانہ واقع کرنیل گنج میں ایک عشرہ مجالس ہوتی تھیں۔ محرم سے چہلم تک ہر اتوار کو ایک مجلس میں بھی پڑھا کرتا تھا۔ نامور ذاکرین لکھنؤ سے بلائے جاتے تھے۔ میں جب مراد آباد آگیا تھا جب بھی ایک مجلس کے لئے ضرور بلایا جاتا تھا۔

عملیات کا شوق

میرے قیام کانپور میں ایک ایرانی بزرگ آقا سید احمد تبریزی کانپور تشریف لے آتے تھے جو آیت مقدس اور مرد متاحض تھے مسمریزم کے بڑے ماہر تھے۔ عمل کبیر سے روحانی علاج کرتے تھے۔ اکثر امراض کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اسی عمل کبیر کے تحت وہ تعویذ لکھا کرتے تھے۔ میں نے بڑی جد وجہد کے بعد یہ عمل حاصل کر لیا جو بے حد مفید ثابت ہوا۔

مولانا محمد ہارون صاحب سے ملاقات

جناب مولانا محمد ہارون صاحب قبلہ زنگی پوری سرکار نجم العلماء کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ عالم متبحر تھے متعدد کتابیں انہوں نے تصنیف فرمائیں۔ جیسے توحید القرآن۔ توحید الائمہ نوادر الادب۔ صحیفہ کاملہ اور کتاب البیعۃ والاسلام کا ترجمہ بھی کیا۔ البرق الیمانی علی مذہب قادیانی۔

مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند لینے کے بعد دہلی کے عربک کالج میں مدرس عربی کی حیثیت سے رہتے تھے کہ کسی سنی طالب علم نے دھوکے سے گوشت کھلا دیا جس سے جذام ہو گیا اور باوجود ہر قسم کے علاج کے شفا حاصل نہ ہوئی۔

میں مولانا کے اوصاف سنتا تھا لیکن ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا مولانا نے پہلی بی بی کے مرنے کے بعد دوسری شادی سادات بارہہ میں کی تھی

آپ کے چچیا خسر سید شبیر حسین صاحب کانپور میں رہتے تھے اور میرے محب خاص تھے۔ مولانا لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور راجہ صاحب محمود آباد کی طرف سے تصنیف و تالیف کا کام کر رہے تھے۔

جب کانپور تشریف لائے تو شبیر حسین صاحب نے اطلاع دی۔ میں شام کو مولانا سے ملنے چلا تو اپنے ساتھ محمد زکی صاحب کو لے لیا۔ یہ اعظم گڑھ کے ایک صاحب تھے معمولی لکھے پڑھے تھے مگر رہتے تھے مولویانہ وضع میں۔ جب ہم دونوں شبیر حسین صاحب کے مکان پہنچے اور اطلاع کرائی تو مولانا برآمد ہوئے اور محمد زکی سے بڑے تپاک سے ملے مجھ سے مصافحہ کر کے رہ گئے میں سمجھ گیا کہ مولانا دھوکہ کھا رہے ہیں چند منٹ گفتگو کے بعد مولانا کے چہرے پر تکدر کے آثار پیدا ہوئے اور یہ کہہ کر اٹھ گئے میں نے ابھی عصر کی نماز نہیں پڑھی۔ میں وہاں سے چلا آیا جب شبیر حسین دفتر سے گھر آئے تو مولانا نے کہا چچی صاحب آپ کے ظفر حسن سے ملا ماشاء اللہ بڑے قابل آدمی ہیں۔

چچا صاحب! آپ نے دھوکہ کھایا ہوگا یہ شخص مرد جاہل ہے چند منٹ کی بات چیت سے پتہ چل گیا انہوں نے حیرت سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی اور صاحب آپ سے ملنے آ گئے۔ بھلا بتائیے تو ان کی وضع قطع کیا تھی۔ مولانا نے محمد زکی کا حلیہ بتایا۔ انہوں نے کہا بے شک آپ کو دھوکا ہوا وہ [illegible] رہنے ہی نہیں وہ تو شیروانی پہنتے ہیں۔ چوڑی دار پاجامہ اور ترکی ٹوپی ہوتی ہے مولانا نے فرمایا اس لباس میں ایک جوان آدمی اور بھی تھے جن سے میں نے مخاطبہ نہیں کیا۔ انہوں نے کہا وہی تو مولانا ظفر حسن تھے آپ جن سے ملے وہ تو مولوی

سید حسین صاحب کے متوسلین میں سے محمد زکی ہوں گے۔

یہ سن کر مولانا کو بڑا افسوس ہوا۔ اور فرمایا مجھے ابھی معذرت کے لئے ان کے پاس لے چلئے۔ مغرب سے پہلے میں اپنے کمرے کے سامنے بیٹھا تھا اور چند احباب سے یہی تذکرہ کر رہا تھا کہ مولانا تشریف لے آئے اور مجھے گلے لگا کر فرمایا۔ مجھے آپ معاف فرمادیں میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا اور یہ دھوکا مجھے آپ کے لباس سے ہوا۔ آپ اپنا یہ لباس بدلئے۔ یہ لباس آپ کے لئے شایان نہیں۔

میں نے کہا میں اسکول میں ملازم ہوں وہاں کے لئے یہی لباس موزوں ہے۔ فرمایا کم از کم پاجامہ کو بدل ڈالئے۔ میں نے کہا میں تعمیل حکم میں چوڑے پائنچہ کا پہننے لگوں گا۔ مگر زیادہ ڈھیلی موری کا نہیں خیر الامور اوسطہا نہ چست ہوگا نہ زیادہ چوڑا۔ مولانا نے شبیر حسین صاحب سے کہا ایک پاجامے کا کپڑا چھمی جان کو لا کر دیجئے وہ ایک پاجامہ اس طرح کا فوراً سی دیں۔ تیسرے روز مولانا پاجامے کر آئے اور اپنے سامنے مجھے پہنوایا چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے وہی صورت باقی رکھی ہے میں اس کو مولانا مرحوم کی یاد کا یادگار سمجھتا ہوں۔

مولانا کو یہ بھی اندازہ کرنا تھا کہ میں کچھ پڑھا لکھا آدمی ہوں یا یوں ہی اہل کانپور پر ہوا باندھ رکھی ہے۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی سید شبیر حسین جو پہلی بیوی سے تھے مولانا کے ساتھ آئے تھے مولانا ان کو شرائع الاسلام کتاب الصلوٰۃ پڑھاتے تھے ایک روز مجھ سے فرمایا جب تک میں کانپور میں ہوں آپ شبیر کو پڑھا دیا کریں میں نے منظور کر لیا۔ تقریباً ایک ماہ جیتی رہی

دیتا رہا۔ جب میری تعلیم سے مولانا کو اطمینان ہوا تو ان کی نظر میں میری وقعت بہت زیادہ ہو گئی۔ پھر تو عالم یہ ہو گیا کہ جب تک کانپور رہتے زیادہ وقت میرے پاس گزارتے۔

میں نے ایسا جفاکش اور دینی خدمت کا شائق نہیں دیکھا۔ انگلیوں کے ناخن گر گئے تھے پور پور پر ورم تھا کہیں کہیں سے جسم پھٹ کر خون ڈھنے لگتا جوڑ جوڑ میں درد رہتا تھا اس پر بھی دینی خدمت کا مشغلہ جاری رہتا۔ انگلیوں میں رومال سے قلم بندھوا کر جس طرح بنتا لکھتے۔ عموماً نصف شب کے بعد عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ بیٹھ کر نماز پڑھتے۔ لیکن واجب نمازیں کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔ قریب صبح بڑے دردناک لہجے میں اپنی کہی ہوئی ایک مناجات پڑھتے۔ جس کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

بچا لو اے خدا والو بچاؤ — تباہی سے مری کشتی نکالو
مری اعضائے جسمی گھن زدہ ہیں — مرے قلب و جگر سب بھن چکے ہیں

۶۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

کانپور میں والدِ مرحوم کی تشریف آوری

والد مرحوم کو انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب سے سخت نفرت تھی انہوں نے میری ولادت سے قبل یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالے نے مجھے لڑکا دیگا تو

میں اسے مولوی بناؤں گا تاکہ وہ دین کی خدمت کرے۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی۔

کانپور میں ایک بار وہ تشریف لائے اسکول کی ضرورت کے لحاظ سے میں نے کچھ انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی ایک صاحب کی زبانی جب والد مرحوم کو یہ پتہ چلا تو بہت دل گرفتہ ہوئے اور ترش لہجے میں فرمایا میری بے اجازت تم نے انگریزی کیوں پڑھی میں نے کہا اسکول کی ضرورت نے مجبور کیا۔ فرمایا اگر ایسا ہے تو اسکول کی نوکری چھوڑ دو۔ اللہ رازق ہے میں تم کو اپنے مذہب کا خدمتگار رہنا چاہتا ہوں نہ کہ کرسٹان۔

زمانہ کی ضرورت اور انگریزی حکومت کے تقاضے سے اگرچہ انگریزی زبان سیکھنا ناگزیر ہو گیا تھا لیکن اس زمانے کے بزرگوں کو اس تعلیم سے جو خدشے پیدا ہوتے تھے وہ غلط نہ تھے۔ انگریزی تعلیم نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کے دل سے روح اسلام کھینچ لی تھی اور ان کا اسلامی معاشرہ فرنگی معاشرہ میں تحلیل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اسلامی عقاید و مراسم کا وقار ان کی نظر سے گرا پھر اسلامی عبادات پر بجلی گری نتیجہ میں اصول و فروع سب طاق نسیاں پہ رکھے گئے نہ نماز سے واسطہ رہا نہ روزے سے نہ زکوٰۃ سے نہ حج سے۔ رفتار و گردار سب پر مغربی تہذیب چھا گئی اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم ایسی سب کتابیں لائق ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ڈیڑھ سو سال کے اندر انگریز نے اپنی تہذیب کا ایسا رنگ ہم پر چڑھایا ہے کہ اس

سے دفان ہوئے بیس صدی گزر چکی ہے لیکن اب تک ہماری ہندوستانی تہذیب کی روح چل پھر رہی ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ ہم اس کی غلامی سے اب تک آزاد نہیں ہوئے۔ لیکن دنیا کے تمدن میں ایک ایسا انقلاب آیا ہوا ہے کہ اب کسی ملک کے بھی باشندے کو اسلامی تہذیب پر باقی رہنا سخت دشوار ہوگیا ہے۔ اب تو ہر مسلمان کو اس قول پر عمل کرنا پڑیگا ۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز ۔

میری پیشنمازی کا مسئلہ

زمانۂ قیام کانپور میں باوجود اصرار احباب میں نے پیش نمازی نہیں کی۔ ایک بار سرکار نجم العلما تشریف لائے۔ چھبند دیوان ناصر علی میں سرکار مرحوم نے نماز ظہرین بجماعت پڑھائی بعد نماز میرے کمرے میں نشست فرمائی۔ میرے چند مخلص احباب نے جناب مرحوم سے عرض کیا کہ مولانا (میں) سے ہم لوگ بار بار کہتے ہیں کہ آپ نماز پڑھایا کیجئے تا کہ ہم لوگ ثواب جماعت سے محروم نہ رہیں۔ مگر یہ منظور نہیں کرتے۔ جناب نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا آپ کیوں نہیں پڑھاتے۔ میں نے کہا میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا فرمایا آپ لوگوں کو ثواب جماعت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ جب لوگوں کو آپ پر اعتماد ہے تو ضرور پڑھائیے۔ میں خاموش ہوگیا۔ چند روز لوگوں کے اصرار سے ٹیکا پور کی مسجد میں نماز پڑھائی اس کے بعد مومنین سے معافی مانگ لی اور ایک پیش نماز کا تقرر کرا کے یہ ضرورت پوری کردی۔

میری مقبول مُناجات

شادی کے بعد میری پہلی بی بی کے بطن سے ایک لڑکی ہو کر رہ گئی۔ کئی سال اولاد نرینہ کی تڑپ میں کئی عمل بھی کئے۔ اس سلسلے میں ایک مناجات لکھی جو بارگاہ باری میں قبول ہوئی اسی سال میرا بڑا لڑکا تہذیب حسن بڑی بی بی کے بطن سے پیدا ہوا جو بحمد اللہ بقید حیات ہے اور صاحب اولاد ہے۔

یہ مناجات کئی بار چھپ چکی ہے۔ سب سے پہلے نواب حامد علی خاں مرحوم رئیس کانپور نے طبع کرا کے مفت تقسیم کی۔ اس کے بعد پٹنے کے ایک صاحب نے ان کے بعد دہلی کے ایک بزرگ نے نہایت خوشنما طبع کرائی اور ہر ایک نے مفت تقسیم کی دو بار میں نے طبع کرائی ایک بار اپنی کتاب تحفۃ المومنین کے دوسری تحفۃ العوام کے اندر چھپی۔

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

یارب غنی ہے ذات تری بے نوا ہوں میں — پابند صد حوادث رنج و بلا ہوں میں
سینہ فگار خنجر حرص و ہوا ہوں میں — تو ہے کریم اور ترے در کا گدا ہوں میں

معبود اپنے عبد کی حالت پہ رحم کر
غربت پہ بے کسی پہ مصیبت پہ رحم کر

بجز تیرے کوئی خلق کا حاجت روا نہیں — ہے کون جس پہ تیرا کرم اور عطا نہیں
واحد ہے تو شریک ترا دوسرا نہیں — سب کو فنا ہے ذات کو تیری فنا نہیں

بے کس کا تو انیس ہے ہمدم علیل کا
تیرا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا

واحد، احد، مجید، قدیر، معبود نام ہے — رزاق خلق و ناصر و محمود نام ہے
معطی، معین، مقصد و مقصود نام ہے — راحم، رحیم، خالق و مسجود نام ہے

محتاج تیری خلق ہے اور بے نیاز تو
عالم کے کاروبار کا ہے کارساز تو

تنہا ہوں کو تو جو چاہے تو دم میں لاکھ کرے — ذرہ کو نور مہر درخشاں عطا کرے
ہر بال بوم غیرت بال ہما کرے — بلبل سے بڑھ کے زاغ کو شیریں نوا کرے

اک مور ناتواں سلیماں وقار ہو
لطف و کرم ترا اگر اے کردگار ہو

سر تیرے در پہ جھکتا ہے شاہ و وزیر کا — مطلب ہے گر غنی کا تو مقصد فقیر کا
مالک ہے کل جہان کے قلیل و کثیر کا — عالم ہے تو ہر ایک کے مافی الضمیر کا

بے کس کی کائنات فقط تیری ذات ہے
بست و کشود بندوں کی سب تیرے ہاتھ ہے

مظلوم کو ستم سے اماں دینے والا تو — غربت میں راستہ کا نشاں دینے والا تو
بیمار غم کو تاب و تواں دینے والا تو — بوسیدہ ہڈیوں میں جاں دینے والا تو

بندوں کی تجھ سے کیسے بھلا التجا نہ ہو
تو ہی تو اس کا ہے کوئی جس کا وا نہ ہو

شفقت ترا باپ کی بھی تجھ کو ہے سوا — سنتا ہے اپنے بندوں کی بے شک تو التجا
درگاہ میں تیرے جو کرے شوق سے دعا — تیرا در قبول ہے ہر دم کھلا ہوا

تو خوش ہو جبکہ تجھ سے کوئی التجا کرے
حاضر ہے اک واسطے جو کچھ دعا کرے

صحرا ہو سبزہ زار ہو یا دشت ہولناک　　دریا ہو جوئبار ہو یا ہو خندق مغاک
کوہ و جبل ہو شہر ہو یا تودہ ہائے خاک　　باراں ہو باد تند ہو یا برق تابناک

حافظ ترا ہے بندوں کا یارب کہاں نہیں
ہر جا ترا نشان ہے اور پھر نشاں نہیں

بندوں کے تو گناہوں کا یارب ہے پردہ دار　　رحمت ہے عام تیری کرم تیرا بے شمار
لاکھوں گناہ گر کرے کوئی گناہ گار　　توبہ سے بخش دیتا ہے تو سب کو کردگار

اہل خطا پہ رزق کا مسدود در نہیں
غداروں پہ قہر کی تیری نظر نہیں

آفت زدہ نے نام ترا لے لیا اگر　　رحمت نے تیری گھیر لیا اس کو سر بسر
درد و الم میں تیرا کرم ہو گیا سپر　　اک لطف کی نگاہ نے کیا کیا کیے اثر

زخمی جگر کے درد کا درماں بھی ہو گیا
فاقہ کشوں کی زیست کا ساماں بھی ہو گیا

آدم کو تو نے آہ و بکا سے بچا دیا　　ساحل پہ بیڑا نوح نبی کا لگا دیا
بہر خلیل آگ کو گلشن بنا دیا　　یعقوب سے پسر کو چھپا کر ملا دیا

ادریس کو حیات خجستہ صفات دی
یونس کو بطن حوت سے تو نے نجات دی

یوسف نے جب کہ قید میں کی تجھ سے التجا　　تو نے عزیز مصر اسے دم میں کر دیا
عیسیٰ پہ جب یہود کی ہونے لگی جفا　　رحمت نے تیری چرخ پہ ان کو طلب کیا

موسیٰ کے واسطے کیا شق رود نیل کو
ہونے دیا نہ ذبح ابن خلیل کو

ظلم قریش جب ہوا احمد پہ آشکار   اور غار میں نہاں ہوئے سرور روزگار
جویا تھی ہر مقام پہ وہ قوم بد شعار   حافظ تھا کون جز ترے اور کون غمگسار
تو نے کرم جو اس گھڑی اے کبریا کیا
مکڑی نے منھ پہ غار کے جالے کو تن دیا

افضال تیرے خلق پہ یا رب ہیں لا کلام   شاہ و گدا کے واسطے بخشش ہے تیری عام
جو جس کو چاہے کردے منصب و مقام   ذیشان تیرے فضل سے تھے انبیا تمام
حضرت کے عہدہ پر کوئی عالی مقام تھا
خلقت کے ساتھ کوئی پیمبر امام تھا

کوئی کلیم تھا ید بیضا دکھانے کو   روح اللہ کوئی مردۂ کہنہ جلانے کو
آوازہ کوئی زہد کا ڈنکا بجانے کو   کوئی حبیب راہ ہدایت دکھانے کو
اعجاز حسن صوت کسی کو عطا کیا
تخت رواں کسی کا ہوا پر ہوا کیا

اے کل کے کار ساز تری عام ہے عطا   سنتا ہے اپنے بندوں کی بے شک تو التجا
ادنیٰ سا میں کمیں ہوں ترا اک عبد بے نوا   بے کس غریب کشتۂ درد و غم و بلا
ذرے کو اپنے فضل سے مہر منیر کر
مجھ پر بھی رحم اے مرے رب قدیر کر

یا رب تجھے ہے آدم و حوا کا واسطہ   الیاس و شیث و صالح و موسیٰ کا واسطہ
ہود و شعیب و یونس و یحییٰ کا واسطہ   اسحق و نوح و یوسف و عیسیٰ کا واسطہ
ادریس و ہود و یونس و ایوب کی قسم
داؤد و خضر و حضرت یعقوب کی قسم

سردار انبیا کی رسالت کا واسطہ — سردار اولیا کی ولایت کا واسطہ
بنت نبی کی عفت و عصمت کا واسطہ — اور حضرت حسن کی شہادت کا واسطہ

مظلوم کربلا کی تجھے پیاس ہی کی قسم
قاسم کی اور اکبرِ نو شباب کی قسم

زین العبا کا باقر و جعفر کا واسطہ — موسیٰ رضا کے فرقِ منور کا واسطہ
پھر تقی نقی دلاور کا واسطہ — اور عسکری کے قلبِ منور کا واسطہ

مہدیٔ دیں کا واسطہ ربِ کریم ہے
کر رحم مجھ پہ اب مری حالت سقیم ہے

عالم ہے تو نہیں ہے تجھے حاجتِ بیاں — جو کچھ بھی میرا حال ہے سب تجھ پہ ہے عیاں
برسوں سے کج روی پہ ہے چرخ ستم نشاں — لاکھوں غم و الم کے مقابل ہے ایک جاں

حالِ زبوں پہ اے مرے غفار رحم کر
خواہاں ہوں تیرے رحم کا داور رحم کر

شرمندہ ہوں کہ تیری اطاعت نہ کر سکا — مجبور ہوں کہ دل سے عبادت نہ کر سکا
نعمت کے وقت شکرِ عنایت نہ کر سکا — تیرے حقوق کی میں رعایت نہ کر سکا

نیکی کا نام تک فردِ حساب میں
کیا چیز لے کے آؤں گا تیری جناب میں

عصیاں کا بار سر پہ مرے بے شمار ہے — اعمالِ زشت سے مرا دل شرمسار ہے
خوفِ لحد کا تیر کلیجے کے پار ہے — پرسش سے روزِ حشر کی سینہ فگار ہے

کچھ کارِ نیک از پئے عقبیٰ نہ ہو سکا
زادِ سفر بھی مجھ سے مہیا نہ ہو سکا

مغرور تیرے در سے میں ہو گیا اے خدا　　لائق نہ تیری شان کے سجدہ کبھی کیا
امر و نہی کا پاس نہ کچھ رکھا مطلقاً　　بھولے سے بھی ہوا نہ ترا طالب رضا
شیطان کے وسوسوں کی مرے دل میں جا رہی
منظور اپنے نفس کی بس وقعت رہی

انجام اپنے کام کا پیش نظر نہ تھا　　کچھ ارتکاب جرم سے مجھ کو حذر نہ تھا
روز جزا کا نام کو خوف و خطر نہ تھا　　تیرے عذاب کا کوئی دل پر اثر نہ تھا
غیروں سے ملتجی ہوا در تیرا چھوڑ کر
محسن بنایا اور کو منہ تجھ سے موڑ کر

طاعت کی گر تو وہ بھی دکھانے کے واسطے　　خیرات کی تو شان بڑھانے کے واسطے
زہد و ورع تھا رنگ جمانے کے واسطے　　علم و عمل تھا فضل جتانے کے واسطے
شیطان کے وسوسوں کی مرے دل میں جا رہی
منظور اپنے نفس کی بس وقعت رہی

دنیا کے عیش کا مجھے ہر دم رہا خیال　　باقی سمجھ رکھا تھا اسے جس کو تھا زوال
صوم و صلوٰۃ جان کو گویا تھی اک وبال　　تن پروری کی فکر میں تھا نفس کا کمال
کھا کھا کے تیری نعمتوں کو بھولتا تھا میں
جتنا تو مجھ کو دیتا تجھے بھولتا تھا میں

یا رب میں گرچہ تجھ سے بغاوت کئے گیا　　لیکن تو اپنے فضل سے روزی دئے گیا
رنج و بلا میں میری حمایت کئے گیا　　ہر حال میں خبر تو برابر لئے گیا
مشکل کے وقت جب کبھی فریاد و آہ کی
معبود تو نے لطف کی مجھ پر نگاہ کی

رحمت کو تیری دیکھ کے مجھ سے ہوئی خطا — امید عفو پہ میں جرائم کئے گیا
ہے بال بال گرچہ خطا سے بندھا ہوا — مایوس پر میں تیرے کرم سے نہیں ہوا

مانا کہ مجھ سا کوئی نہیں ہے سیہ کار
رحمن تجھ سا بھی تو نہیں میرے کردگار

لائق ہوں اس سزا کے جو تجویز ہو سزا — دوزخ میں پھونک دے مجھے رکھکر تو بے بہا
لیکن تری کریمی کا یارب ہے اقتضا — مجھ سے گناہگار کی بھی بخش دے خطا

تو ہے کریم میرے معاصی کو بخش دے
مجھ سے بھی عبد مذنب و عاصی کو بخش دے

یارب فریق ہجر و بلا کو نجات دے — گمراہ کوئے مہر و وفا کو نجات دے
یارب اسیر قید خطا کو نجات دے — محبوس دام رنج و بلا کو نجات دے

جز تیرے کس سے جا کے بھلا التجا کروں
یارب میں اپنے حال پہ کب تک بکا کروں

عالم ہے تو کہ حال بہت ہے مرا زبوں — فرط غم و الم سے جگر ہو گیا ہے خوں
کب تک یہ ظلم طالع آفت نشاں سہوں — کب تک نہ تجھ سے شکوۂ درد نہاں کروں

ناسور لاکھ ہیں دل حسرت مکاں میں
اک آگ سی لگی ہے تن ناتواں میں

راحت نہ دن کو ہے مجھے نہ رات کو قرار — رگ رگ میں ریشے ریشے میں پنہاں ہے غم کا خار
صبر و رضا کا میرے گریباں ہے تار تار — سو آفتیں ہیں اور مری ایک جان زار

کس سے کہوں جو روح پہ صدمہ گزرتا ہے
بے موت تیرا بندۂ نادار مرتا ہے

دل کی لگی کو کون بجھائے سوا ترے — درد و الم کو کون مٹائے سوا ترے
حالِ شکستہ کون بنائے سوا ترے — ہے کون مجھ پہ رحم جو کھائے سوا ترے

بیکس کا کوئی مونس و غم خوار بھی نہیں
جو غیر سے علاج وہ آزار ہی نہیں

شاخِ مراد میں مری تازہ ثمر دکھا — اجڑے چمن میں بادِ سحر کا گزر دکھا
بے نور گھر ہے جلوۂ روئے قمر دکھا — روشن ہو جس سے آنکھ وہ نورِ نظر دکھا

تیرے خزانے میں مرے معبود کیا نہیں
میری تو التجا میں کوئی انتہا نہیں

ہے آرزو یہ دوسری اے میرے کبریا — جو کچھ کہ مجھ پہ [illegible] ہو جائے سب ادا
اعدا کریں نہ میری ہلاکت کا مشورہ — بس [illegible] ہو آفت کا سامنا

بندوں کے جب کہ قرض سے مجھ کو نجات ہو
دنیا سے قطع تب مرا تارِ حیات ہو

شیطان کے شرور سے یا رب ملے پناہ — احباب سے بھی تیرے ہمیشہ رہے نباہ
فسق و فجور کی نہ کبھی دل کو ہوئے چاہ — تیرے سوا نہ غیر سے میری ہو رسم و راہ

توفیق مجھ سے تیری اطاعت کی کم نہ ہو
بس اک غمِ حسین ہو اور کوئی غم نہ ہو

عزت نگاہ رکھ مری دشمن کے ہاتھ سے — مجھ کو نہ آنچ آنے پائے کائنات سے
ایذا نہ تیرے بندوں کو میری ذات سے — گمراہ ہو نہ جاؤں میں کوئے نجات سے

سرزد کوئی خطا نہ ہو مجھ دل ملول سے
وابستہ رکھنا دامنِ آلِ رسول سے

جو مر چکے ہیں میرے عزیزان نامور — یارب تو ان کی روح پہ کر لطف کی نظر
ہو جنت نعیم میں ان کے لئے مقر — سائے میں اپنے رحم کے رکھ ان کو سر بسر
انجام ہو بخیر مرے والدین کا
دیتا ہوں تجھ کو واسطہ خون حسین کا

دے اتنی مقدرت مجھے اے رب ذوالکرام — ارکان حج کو کعبے میں جا کر کروں تمام
ہو حاجیوں کی فرد میں مرقوم میرا نام — اے لامکاں دیکھ لوں میں بھی ترا مقام
اس گوہر مراد کی ہر وقت ہے طلب
بطحیٰ کے سنگریزوں کو دل ڈھونڈتا ہے اب

پہنچا دے اپنے فضل سے اس سرزمیں پہ — مدفون جس مقام پہ ہیں سید البشر
دن رات شوق دید میں بے تاب ہے جگر — درپیش ہو مدینہ کا یارب مجھے سفر
حسرت یہ ہے طواف کروں قبر پاک کا
سرمہ بناؤں مرقد احمد کی خاک کا

سوئے نجف مدینہ سے پھر رخ پھراؤں میں — روضہ کو مرتضےٰ کے گلے سے لگاؤں میں
سر آستانہ شہ دیں پر جھکاؤں میں — گرد مزار اپنے کو صدقے پھراؤں میں
دُرِ نجف سے دامن مقصود کو بھروں
ہے التجا کہ زائر شیر خدا بنوں

ہوتا ہوا وہاں سے خراسان و سامرا — آؤں میں کاظمین میں لے رب دوسرا
زائر ہوں پھر جناب حسین شہید کا — آنکھوں سے دیکھوں روضۂ سلطان کربلا
آ کر یہیں لحد مری اے کبریا بنے
تا میری خاک قبر بھی خاک شفا بنے

حاجت نہیں ہے کچھ مال و منال کی — زر کی طلب ہے اور نہ یاقوت و لال کی
منظور رحمت تیری ہے فقط اب مآل کی — کشتی لگا دے پار پریشان حال کی

مسجود مجز تیرے نہ کوئی غیر ہو مرا
دین نبی پہ خاتمہ بالخیر ہو مرا

ہنگام جاں کنی نہ ہو شدت عذاب کی — ہیبت نہ قہر لاش کو مجھ دل کباب کی
ساعت جب آئے مجھ سے سوال و جواب کی — تلقین تیرے فضل سے ہو بوتراب کی

تاریکی لحد سے نہ دل گوشہ گیر ہو
مرقد میں نور روئے جناب امیر ہو

جب حشر میں صراط پہ جائے مری نظر — سرعت سے اس پہ بار الٰہا کروں گزر
محشر میں ہو نہ حدت خورشید کا اثر — داماں اہل بیت کا سایہ ہو فرق پر

ہوگی نگاہ لطف اگر تجھ کریم کی
ہرگز جلا سکے گی نہ آتش جحیم کی

ہے عاصی حزیں کی یہی آخری دعا — بیمار مومنیں جو ہیں ان کو ہو شفا
جو لاولد ہیں دے انہیں فرزند مہ لقا — عسرت زدوں کو صدمۂ افلاس سے بچا

محفوظ رکھ انہیں جو غریب الدیار ہیں
کر بہرہ ور جو لطف کے امیدوار ہیں

ساعت ظہور حضرت حجت کی جلد لا — کب تک یہ انتظار کی گھڑیاں گنیں بھلا
کر دہر عدل و داد سے عالم کو پرضیا — شرک و نفاق و کفر کی بنیاد کو مٹا

جلوہ دکھا دے روئے امام انام کا
خادم بنا دے مہدی عالی مقام کا

میری تصانیف کا آغاز

کانپور میں مجھے تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے فارسی قواعد کی ایک مختصر القواعد کے نام سے لکھی۔ اس کے بعد اصحاب رسول لکھی جس میں جناب سلمان و ابوذر و عمار و مقداد رضی اللہ عنہم کے حالات تھے پہلے خود چھپوائی پھر یوسفی پریس دہلی نے چھاپی۔ اس کے بعد آئینہ اسلام لکھی جو پیسہ اخبار لاہور نے چھاپی اس کے بعد گلدستہ مضامین کا نمبر آیا اس میں ہائی اسکول کے طلباء کے لئے ایک سو مضامین ہیں اس کو رام نرائن لال بکسیلر نے چھپوایا یہ کتاب چھ سال ہائی اسکول کے نصاب میں داخل رہی اس کے بعد یہ سلسلہ روز بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد دو سو چونتیس تک پہنچ گئی یہ سب بحمد اللہ مطبوعہ ہیں۔

میری کتابیں تین قسم کی ہیں۔

(۱) جن کو تعلیمی ضرورت کے لئے لکھا گیا۔ ان میں سے کئی کتابیں ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ اور اردو مڈل کے امتحانات میں داخل رہیں اور بعض بطور معاون کتابوں کے۔

(۲) جن کو میں نے تحقیقی اور ادبی ذوق کی بنا پر لکھا۔

(۳) مذہبی کتابیں جن کی اشاعت کے لئے ۱۹۳۰ء میں شمیم بکڈپو قائم کیا گیا جو بحمد اللہ آج تک قائم ہے۔ ۱۹۱۲ء سے میری تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک چلا آرہا ہے کسی وقت رکا نہیں۔

۱۹۳۰ء سے رسالہ نور کا اجرا ہوا جس میں اکثر مضامین میرے ہی ہوتے تھے۔ نثر کے علاوہ ہر ماہ میری ہی نظمیں نور میں چھپا کرتی تھیں ان نظموں کی تعداد بھی کئی سو ہے۔

رسالہ نور سنہ ۱۹۶۰ء سے کئی وجوہ کی بنا پر بند ہوگیا۔ اول تو حکومت کی طرف سے یہ قدغن کہ کوئی مضمون ایسا نہ ہو جو مسلمانوں کے کسی فرقے کے لئے دل آزاری کا باعث ہو اس کی تعمیل ایک مذہبی رسالہ کے لئے بہت دشوار تھی دوسرے قوم میں مذہبی اخبار اور رسائل کے زیادہ ہونے سے آمدنی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی اور کئی سال سے رسالہ خسارہ میں چل رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ عالم پیری میں رسالے کے صفحات کی پُری اور کتابوں کی تصنیف دو کام ایک ساتھ اب نہیں چل سکتے تھے۔

نور اور تصانیف کے علاوہ قومی اخبارات وجرائد میں بھی میں بے شمار مضامین لکھتا رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ پچاس سال کے اندر رم کے رم سیاہ کر ڈالے۔ اس زندگی میں آرام کی گھڑیاں میرے لئے بہت کم تھیں۔ ہر کام کے لئے ایک وقت تھا اور ہر وقت کے لئے ایک کام۔

نور ۵۰ سال تک میری ادارت میں جاری رہا اس طویل مدت میں میں نے کبھی اہل قلم کی گداگری نہیں کی اور ان کے مضامین کے سہارے پر رسالہ کے اجراء کو موقوف نہیں رکھا بلکہ یہ سب بار اپنے قلم کی نوک پر ہی رکھا۔

ایک انگریز کی اتالیقی

زمانہ قیام کانپور میں ایک انگریز کو جو امپیریل ٹوبیکو کمپنی کا منیجر تھا مجھے اردو پڑھانے کا موقع ملا اس کا نام گارڈنر تھا وہ معقول آدمی تھا۔ مذہبیات سے

اسے بڑی دلچسپی تھی وہ اکثر اوقات مذہبی مسائل میں مجھ سے تبادلہ خیال کرتا رہتا تھا۔ اسلام پر اس کے دو بڑے اعتراض تھے اول یہ کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی تاریخ میں غداری کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا کہ مسلمانوں نے غداری نہ کی ہو۔ اس غداری کا سلسلہ ان کے رسول کے مرنے کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ عیسائیت میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔

میں نے کہا جو اسلام کے سچے پیشوا تھے انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا اس نے پوچھا وہ کون تھے۔ میں نے خلافت کے متعلق چیدہ چیدہ حالات بیان کئے اس نے بڑی دلچسپی سے سنا اور حضرت علیؑ کے طرزِ جہانبانی اور واقعاتِ شجاعت سے بڑا متعجب ہوا۔ تقریباً ۲ ماہ میں نے اسے پڑھایا اس مدت میں بہت سے مسائل زیرِ بحث آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اہلِ بیتؑ سے ایک قسم کی عقیدت پیدا ہو گئی۔

ایک روز میں نے حدیثِ ہلیلہ کا ترجمہ بزبانِ انگریزی اس کو دیا کہ آپ اسے پڑھئے کئی روز کے مطالعے کے بعد اس نے کہا یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ ہلیلہ سے اللہ کے وجود پر بہت خوب بحث کی ہے۔ یہ امام جعفر صادقؑ کون ہیں۔ میں نے اسے بتایا۔ وہ کہنے لگا میرا ایک دوست دہریہ ہے یہ کتاب میں اسے پڑھنے کے لئے دوں گا آپ یہ کتاب مجھے دیدیں میں اپنے ساتھ ولایت لے جاؤں گا۔ میں نے کہا بخوشی۔

پیارے صاحب رشید کی مجلس میں ہنگامہ

ابھی میں زمانہ قیام کانپور کے واقعات بیان کر رہا ہوں۔ ان میں سے ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر پیارے صاحب رشید نے لکھنؤ میں اس بنا پر مجالس پڑھنی چھوڑ دی تھیں کہ افیونی صاحبان اپنے فلک سیر دماغ سے نکلی ہوئی وہ بے نظیر داد دیتے تھے کہ لوگوں کو ہنسی ضبط نہ ہوتی تھی اہل کانپور نے رشید صاحب کو مدعو کیا۔ جب یہ خبر لکھنؤ میں اڑی تو بہت سے لوگ کانپور پہنچ گئے۔ ان میں وہ فلک سیر اور جہاں پیما کچھ حضرات شامل تھے جن کی آمد سے رشید صاحب گھبراتے تھے۔

سردی کا موسم تھا اور رات کے وقت محلہ ٹپکاپور میں یہ مجلس تھی۔ مرثیہ رشید صاحب کی شاعری کا آئینہ دار تھا لوگ کھڑے ہو ہو کر داد دے رہے تھے۔ میری برابر ایک بوڑھے نواب لال دوشالا اوڑھے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اور اپنے خیالات میں غرق تھے دوشالے کے اندر ہاتھ میں بٹیر تھی بار بار اسے اوپر اوپر نیچے کر رہے تھے جسے اصطلاح میں موٹھ لگانا کہتے ہیں۔ بشیر حسین صاحب جو ظرافت کی پھلجھڑی تھے میری بائیں جانب تھے مجھ سے پوچھنے لگے یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا معلوم نہیں۔ انہوں نے کہا ذرا آپ جگہ بدل لیں میں ہٹ گیا انہوں نے پوچھا جناب نواب صاحب یہ آپ کے دست مبارک میں کیا ہے جسے آپ مرثیہ سنوا رہے ہیں۔ نواب صاحب نے اس سوال پر کوئی توجہ نہ فرمائی کیونکہ ان کے خیال میں بٹیر ایک ایسا جانور تھا جسے سات پردوں کے اندر بھی

جان لینا چاہیئے بشیر حسین صاحب نے جب دوبارہ یہ سوال کیا تو نواب صاحب کو غصہ آگیا۔ اور جھنجھلاتے لہجے میں بولے ہوں کیا چیز ہے آپ یہ بھی نہیں جانتے۔ مگر جب کہیں کے بشیر حسین نے جب تیسری بار یہی سوال کیا تو دوشالے سے منھ نکال کر غصہ سے بولے۔ کیا چیز ہے۔ کیا چیز ہے بھینس ہے اور کیا ہے اس جانگلو پن کی انتہا ہو گئی۔ یہ کہہ کر دوشالہ میں چھپا لیا۔ انہوں نے پھر چپکے سے پوچھا۔ سرکار یہ کتنا دودھ دیتی ہوگی بس پھر کیا تھا قیامت آگئی۔ غصے میں بھرے اٹھ کھڑے ہوئے اور بھینس کی دو ٹانگیں چیر کر پھینک دیں اور یہ فرماتے ہوئے مجلس سے نکل گئے لاحول ولاقوۃ آدمی ہے یا جانور پوچھتا ہے۔ بھینس کتنا دودھ دیتی ہے تیرے باپ نے بھی کبھی بھینس پالی ہے۔

تصور کیجئے اس کے بعد مجلس کا کیا رنگ رہا ہوگا اور رشید صاحب پر کیا گزری ہوگی۔ مرثیہ بند کرکے منبر سے اترنا ہی چاہتے تھے کہ لوگوں نے بڑی خوشامد درآمد کرکے پھر پڑھوایا۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ اور بھی سن لیجئے۔

نواب واحد علی خاں صاحب کانپور کے ایک بوڑھے ہر دل عزیز نواب تھے افیون کھاتے تھے مگر اتنی نہیں کہ فلک سیر ہو جائیں صبح کو چائے کے لئے میں چند بیدار دل اور روشن دماغ افیونی وہاں جمع ہو جاتے تھے بشیر حسین صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا آپ چھٹی کے دن بھی تفریح نہیں کرتے یہ صحت کے لئے مضر ہے آئیے آپ کو ایسی جگہ لئے جاتا ہوں جہاں آپ کی دماغی تفریح کا پورا پورا

سامان ہو۔

وہ مجھے لے کر نواب صاحب کی نشست گاہ پر پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ دو نو طرف بنچوں پر روشن خیال فلک پیما۔ ارسطو خیال سر جھکائے کسی اہم معاملے پر غور فرما رہے ہیں۔ اور بعض خوش فکر آنکھیں بند کئے واقعاتِ عالم پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے مٹی کی ایک دیولہ پر بالائی رکھی ہوئی ہے جیسے ان سے پہلے بہت سی مکھیاں نوش جان فرما رہی ہیں چائے ملنے کا انتظار ہے۔ سماوار گرم ہے نواب صاحب بھاپ سونگھ کر اندر کا حال معلوم کر رہے ہیں۔ بشیر حسین صاحب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہر ایک فیونی کے سامنے سے دیولہ اٹھا اٹھا کر بالائی چاٹ گئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ چائے تیار ہوئی تو اس کی تقسیم شروع ہوئی۔ اب ایک صاحب نے دیولہ کی طرف ہاتھ بڑھایا وہاں دیولہ کہاں۔ اپنے پاس والے سے کہنے لگے اے حضرت کیا آپ نے میری بالائی اٹھا لی انہوں نے کہا میاں صاحب آپ کیا فرماتے ہیں میرے پاس نہیں یہ دیکھئے یہ کہہ کر ٹٹولا تو بالائی ندارد۔ جب ہر ایک کو پتہ چلا کہ اس کے گھر چوری ہو گئی تو سب کی بند آنکھیں کھل گئیں اب وقت آیا کہ دماغی صلاحیت کو پوری قوت سے صرف کیا جائے۔ اور اس خوفناک ڈاکو کا پتہ چلایا جائے جو آنِ واحد میں سب کی دولت لوٹ کر لے گیا۔ ایک بزرگ نے فرمایا واللہ بڑا بھاری چور تھا ہم سب کی کھلی آنکھوں میں لے اڑا۔ دوسرے بولے ضرور اپنے ساتھ کلوروفارم لایا ہوگا۔ تیسرے نے کہا جی نہیں صاحب یہ چور کوئی ضرور جادوگر تھا۔ ہم سب کے سروں پر اپنا ڈنڈا گھما کر لے بھاگا۔ الغرض مختصر اتنی باتیں جب کسی طرح چور کا پتہ نہ چلا اور مالِ مسروقہ برآمد نہ ہوا

تو ایک صاحب نے بشیر حسین صاحب سے کہا میر صاحب کچھ آپ نے غور کیا کہ یہ سانحۂ عظیم ہوا کیسے۔ انہوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا معاملہ ہے اس میں غور و فکر کی کیا ضرورت ہے چور آئے اور لے گئے۔ ہائیں میر صاحب چور لے گئے اتنی جرأت اتنی ہمت ممکن ہی نہیں۔ دوسرے بولے آخر آئے کدھر سے اور لے کیسے گئے ہماری موجودگی میں۔ انہوں نے کہا اگر آپ نے چوروں کی تاریخ پڑھی ہوتی تو یہ تعجب نہ ہوتا۔ اس قوم نے بڑی بڑی سرنگیں کھود کر قلعوں کے اندر سے شہزادیوں کے چھپر کھٹ اٹھائے ہیں آپ بالائی کے دیلے ہی پر تعجب کر رہے ہیں۔ ایک صاحب بولے واللہ میر صاحب آپ نے ٹھیک کہا۔ چنن صاحب کیسے ہیجان ہوا۔ طلسم ہوش ربا میں ہم نے ایسے واقعات پڑھے ہیں لیکن میر صاحب یہ تو فرمائیے اس کی روک تھام کیوں کر ہو اگر یہ نابنجار کل پھر آ گئے تو ہماری چائے کا فراہی کرکرا ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کل جب آپ آئیں تو ایک ایک ڈنڈا اپنے ساتھ لائیں ذرا آہٹ ہو تو تڑ سے چور کے سر پہ ماریں۔ ایک پٹ گیا تو سب بھاگ جائیں گے۔" تازی مارا تو ترکی کانپا"۔

اس کے بعد میں بشیر حسین چلے آئے۔ راستے میں مجھ سے کہا کہیے کچھ تفریح ہوئی میں نے کہا تفریح سی تفریح تھی۔ انہوں نے کہا میری خاطر سے کل آپ پھر آئیں چنانچہ دوسرے دن گئے تو دیکھا سب کے سامنے ایک ایک ڈنڈا دیولے کے پاس رکھا ہوا ہے اور آنکھیں بند کئے چور کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کمرہ کا ایک دروازہ نواب صاحب کے زنانخانے میں کھلتا تھا۔ اتفاقاً ایک چھوٹی سی لڑکی اس کمرے میں آئی اور ایک صاحب کے دیولے پر ہاتھ ڈالا۔ ان صاحب نے تاک تیرے کی

کھینچ کر ایک سونٹا معصوم بچی کو رسید کیا۔ وہ بلبلا گئی۔ پھر تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ ہر ایک مارنے والے کو برا کہنے لگا۔ ارے جین صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔ آپ کو چوچے اور لڑکی میں تمیز نہ ہوئی۔ وہ نواب صاحب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔

تھیوسوفیکل اسکول و کالج

کانپور کے جس اسکول میں میرا تقرر ہوا تھا وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کا قائم کیا ہوا تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء میں اس کا آغاز ہوا۔ اس سوسائٹی کی بانی اینی بسنٹ لیڈی تھیں جن کا پایہ تحریر و تقریر میں بہت بلند تھا اور ان پر ہندو فلاسفی کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اس سوسائٹی کے میمبر یوں تو ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے۔ مگر اکثریت ہندوؤں کی تھی اس کے دستور العمل کی ایک دفعہ تھی برادر ہڈ۔ یعنی بھائی چارہ۔ اس سوسائٹی کا میمبر بننے کے بعد ہر مذہب و ملت کا آدمی ایک دوسرے کا بھائی ہو جاتا تھا دوسرے یہ کہ ہر مذہب حق ہے۔ ہر راستہ خدا کی طرف لے جانے والا ہے لہٰذا کسی مذہب کی مذمت نہ کرو۔ میرے نزدیک تو یہ خوشنما ہی ڈھونگ تھا اور سادہ لوحوں کو پھانسنے کے لئے ایک خوشنما جال۔ میرے اوپر تو بہت کچھ ڈورے ڈالے گئے۔ مگر میں ان کے قابو میں کہاں آنے والا تھا۔

پہلے یہ مڈل تھا پھر ہائی اسکول ہوا پھر کالج بنا کالج بننے کے بعد مجھے

پروفیسری کی جگہ مل گئی۔ جب یہ کالج بنا تو ایک خشتیل ویک کیا گیا۔ اس میں مختلف
موضوعات پر لیکچر دیے گئے۔ سب سے اول نمبر پانے والے کے لئے ۲۵۰ روپیہ
انعام مقرر تھا۔ یہ انعام میں نے حاصل کیا اس جلسے میں نول کشور پریس کے منیجر
بھی تھے ان کو یہ لیکچر بہت پسند آئے ڈھائی سو روپے میں وہ مجھ سے لیکر انہوں نے
چھپوائے اور اس کتاب کا نام کارخانۂ عالم رکھا۔ میں نے نہایت عزت کے ساتھ
یہاں سات برس گزارے۔ جب یہ کالج سرمایہ کی کمی کی وجہ سے بند ہوا تو میں
مرادآباد آ گیا

پٹیالہ کے خلیفہ خاندان سے وابستگی

وزیر الدولہ خان بہادر خلیفہ سید محمد حسن صاحب ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم تھے۔ سامانہ کے جو ریاست پٹیالہ کا ایک قصبہ ہے رہنے والے تھے۔ یہ پانچ بھائی تھے جو ریاست کے ارکان اعلےٰ تھے۔ درحقیقت ان ہی حضرات نے ریاست پٹیالہ کو جو ایک معمولی سکھ ریاست تھی ترقی دے کر ہندوستان کی ممتاز ریاستوں میں سے بنایا تھا ان کے اقتدار اعلےٰ کا اس سے اندازہ کیجئے کہ مہاراجہ خود ان کے گھر آتا تھا۔

وزیر صاحب مرحوم کے پوتے میجر خلیفہ سید ہادی حسن صاحب جن کا شمار پنجاب کے ممتاز رؤسا میں تھا۔ بڑے وجیہ انسان تھے ان کی رہائشی کوٹھی

بڑی شاندار تھی اسی کے ایک حصہ میں عزاخانہ تھا اس میں عشرۂ محرم مجالس ہوتی تھیں ان کو ۱۹۳۰ء میں ایک واعظ کی جستجو ہوئی۔ پٹیالہ کے ایک صاحب جو بشیر حسین صاحب کے دوست تھے لکھا کہ اگر کانپور میں کوئی صاحب ہوں تو ان سے تحریک کیجیے بشیر حسین صاحب نے مجھ سے ذکر کیا میں نے منظور کر لیا۔

میں چونکہ کہنہ مشق واعظ نہ تھا اور پنجاب اب تک گیا نہ تھا لہذا دل میں دھڑکن تھی بہرحال پہلی محرم کو میں پٹیالہ پہنچ گیا۔ خلیفہ صاحب نے ایک آدمی اسٹیشن بھیج دیا تھا اس نے مجھے وزیر صاحب کی پرانی کوٹھی پر پہنچایا جو مکان مجلس کے قریب ہی تھی وہاں میر مہدی حسن قلعہ دار نے میرا استقبال کیا اور چائے پلانے کے بعد کہا مجلس تیار ہے تشریف لے چلیے۔ میں گیا تو عزاخانہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ سب لوگ میرے منتظر تھے۔ میرے جاتے ہی ایک صاحب نے کہا بسم اللہ۔ میں منبر پر گیا۔ میرا بیان مناظرانہ ہوتا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ سب مجمع مومنین کا ہے بے دھڑک اپنے رنگ میں مجلس پڑھنی شروع کر دی۔ چند ہی منٹ بعد احساس ہوا کہ میرا بیان اس ماحول کے خلاف ہے۔ لیکن بیان بدلنے پر چونکہ قدرت نہ تھی لہذا یہ کہہ کر مجلس ختم کر دی چونکہ سفر کی تکان ہے اس لئے زیادہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

ختم مجلس کے بعد امام خانے کے پہلو میں جو کمرہ تھا وہاں مجھے لے گئے۔ اس خاندان کے خاص خاص افراد وہاں جمع ہوئے۔ ایک ایک کا مجھ سے تعارف کرایا گیا وہ سب میرے لئے اجنبی تھے۔ میں نے کہا اثنائے تقریر میں مجھے آپ حضرات کے چہروں سے پریشانی محسوس ہوتی تھی اس کی کیا وجہ تھی۔ اس خاندان

کے بزرگ جناب خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب قبلہ نے فرمایا۔ اس مجلس میں شیعوں سے
زیادہ سنی تھے آپ نے ان کے عقائد کا بے محابا آپریشن شروع کر دیا جس سے ان کو
توحش اور ہم کو اضطراب لاحق ہوا۔ میں نے کہا میری ایک درخواست ہے۔ آپ
حضرات اسے منظور فرمائیں اور وہ یہ ہے کہ میں کوئی کہنہ مشق ذاکر نہیں ہوں۔
ان مجالس کے لئے جو تیاری میں نے کی ہے اس کے بدلنے پر مجھے قدرت نہیں۔ لہذا بہتر
ہوگا کہ آپ آج ہی مجھے رخصت کر دیں تاکہ آپ کی مجالس بے کیف نہ ہوں۔ اور
میں ناکامی کی ندامت سے بچ جاؤں ان حضرات نے بیک زبان فرمایا یہ کیسے
ممکن ہے کہ ہم آپ کو جانے دیں آپ باطمینان قلب مجالس پڑھیں اس کا کافی ہے
کہ الفاظ دل خراش نہ ہوں اور کھلم کھلا کسی پر چوٹ نہ ہو۔

یہ عشرہ میں نے پڑھا تو مگر بڑی دماغ سوزی اور جگر کاوی کے ساتھ
کیونکہ ما فی الذہن کے بہت سے حصے بدلنا پڑے جس سے بیان میں کمزوری پیدا
ہو گئی۔

عشرہ ختم ہونے کے بعد جب میں چلنے لگا تو یہ کہہ کر چلا سال آئندہ آیا تو
اس ماحول کے مطابق تیاری کر کے آؤں گا ورنہ نہ آؤں گا۔

چنانچہ اس کے بعد یہ وقت مجھے پیش نہ آئی پھر تو میری مقبولیت ہوئی کہ اطراف
پٹیالہ سے لوگ مجلس سننے کے لئے آنے لگے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے آخر سنہ ۱۹۴۶ء تک (تقسیم ملک
سے پہلے) میں یہ عشرہ پڑھتا رہا چونکہ یہ خاندان حسن اخلاق کا مجسمہ اور علمی مذاق
کا قدر دان تھا لہذا روز بروز میری وقعت ان کی نظر میں بڑھتی ہی چلی گئی اور
اختلاط و ارتباط اس حد بڑھا کہ میں اس خاندان کی فرد معلوم ہونے لگا۔

ان کا برتاؤ اس مدت میں میرے ساتھ ایسا رہا جیسے مریدوں کا اپنے پیر کے ساتھ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس خاندان نے بالخصوص اس خانوادہ گرامی کی ایک ممتاز و مقدس شخصیت مولانا خلیفہ محمد ہاشم صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے ذاکر بنایا ہمیشہ میرے بیان کی خامیوں سے چشم پوشی کرکے میرا دل بڑھانے کے لئے داد دیتے رہے۔ میں جس کوٹھی میں ۲۰ سال عشرۂ محرم میں قیام پذیر رہا۔ وہ وزیر صاحب مرحوم کے پوتے خلیفہ سید ہادی حسن صاحب کی تھی۔ خلیفہ صاحب اس خاندان کی بلحاظ وجاہت و تمول و اقتدار ایک نمایاں فرد تھے اور بڑے وجیہ و شکیل جوان تھے۔

پہلے سال انہوں نے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں ٹھہرایا تھا جو بڑے قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ پہلے ہی روز جب وہ شام کو کوٹھی کے صحن میں آکر بیٹھے تو مجھے کچھ آزردہ سا پایا کہنے لگے آپ کچھ دل گرفتہ اور پریشان خاطر سے معلوم ہوتے ہیں میں نے کہا آپ کا خیال درست ہے میں ضرور پریشان ہوں۔ پوچھا کیوں میں نے کہا آپ نے مجھے غلط جگہ ٹھہرایا ہے میں ایک غریب آدمی ہوں سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والا۔ ایسی پُر تکلف جگہ میرے لئے مناسب نہیں۔ دوسرے مجھ سے ملنے ہر قسم کا آدمی آئے گا اگر کوئی چیز آپ کے کمرہ سے چوری ہوگئی تو اس کا سبب میں قرار پاؤں گا۔ آپ کا نقصان ہوگا اور مجھے ندامت۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے امام خانہ سے متصل وہ کمرہ دیدیں جس میں آج بعد مجلس بیٹھے تھے انہوں نے کہا بہتر ہے۔ چنانچہ اسی روز اس کمرہ میں منتقل ہوگیا

یہ کمرہ ۴۰ سال عشرۂ محرم میں میری قیام گاہ رہا یہاں تک کہ وہ مولوی صاحب کا کمرہ کہلانے لگا۔

خلیفہ صاحب مرحوم کی عقیدت ہر سال مجھ سے بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ وہ اپنا زیادہ وقت میرے ہی پاس گزارتے تھے اور میری ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے رہے۔

وزیر صاحب مرحوم نے اپنی لاجواب کتاب اعجاز التنزیل کی تصنیف کے لئے جو عظیم الشان کتب خانہ جمع کیا تھا اگرچہ اس کی بہت سی کتابیں تلف ہو چکی تھیں تاہم ان کی تعداد کافی تھی یہ کتب خانہ میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔

حضرات سامانہ کی یہ خواہش ہوئی کہ رات کی مجلس میں بخاریوں کے عزا خانہ میں پڑھا کروں چنانچہ کئی سال یہ معمول رہا کہ میں شام کے چار بجے ایک کار کے ذریعہ سے جو زیر رو کر لی جاتی تھی میں سامانہ جاتا تھا اور ختم مجلس کے بعد وہیں میر سید علی صاحب مرحوم کے مکان میں سوتا تھا۔ صبح سویرے ناشتے کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر پٹیالہ آجاتا تھا اور دس بجے یہاں مجلس پڑھتا تھا۔ اکثر خلیفہ ہادی حسن صاحب میری مجلس سننے کے شوق میں میرے ساتھ سامانہ آتے تھے اور صبح کو میرے ساتھ واپس ہوتے تھے۔

سامانہ میں عاشورہ کے دن تسبیح کی زیارت ہوتی تھی۔ ایک بار شب عاشورہ خلیفہ صاحب نے کہا بیگم صاحب تسبیح کی زیارت کے لئے سامانہ جانا چاہتی ہیں آپ استخارہ کیجئے۔ استخارہ منع آیا۔ انہوں نے بیگم صاحب سے کہا کہ استخارہ نہیں

تھا۔ وہ آزردہ ہو گئیں۔ خلیفہ صاحب پھر رات کو میرے پاس آئے اور کہا آپ دوبارہ وقت کی قید کے ساتھ دیکھئے میں نے کہا مطلق صورت میں منع آچکا تو اب پھر استخارہ کرنے کا کیا محل ہے۔ وہ نہ مانے تو میں نے پھر تسبیح ہاتھ میں لی استخارہ آگیا۔ کہنے لگے استخارہ کیا ہے ایک تماشا ہو۔ میں نے کہا آپ نے قدرت سے مذاق کیا۔ اس نے کہا اچھا تو جو تمہارا دل چاہتا ہے کر کے دیکھو اس جواب سے انہیں کچھ تسکین نہ ہوئی کہنے لگے تو میں اور آپ چلیں تسبیح کی زیارت کے بعد واپس آجائیں گے۔ تعزیہ اپنی مجلس میں رکھو جو ۴ بجے شام کو ہوتی تھی اشریک ہو جائیں گے۔ صبح ۸ بجے ہم دونوں روانہ ہوئے سامانہ پٹیالہ سے ۱۸ میل دور تھا۔ وہاں پہنچ کر تقریباً دو بجے تسبیح کی زیارت کی اس کے بعد واپس ہوئے دو میل چلے تھے کہ کار خراب ہو گئی کہ شام تک وہیں پڑے رہے نہ فاقہ شکنی ہوئی نہ مجلس میں نے کہا کہئے خلیفہ صاحب اگر بیگم ساتھ میں ہوتیں تو کیا گت بنتی انہیں کہاں بٹھایا جاتا بولے اب میں استخارے کا قائل ہو گیا۔

پٹیالہ میں عشرہ محرم میں صرف عاشورہ کو شیعوں کا ایک تعزیہ امام خانہ کنندہ میرے اٹھا کرتا تھا جس کی گشت صرف ایک مختصر سے کوچہ میں ہوتی تھی۔ میں نے خلیفہ ہادی حسن اور خلیفہ محمد ہاشم صاحب کو اس طرف توجہ دلائی کہ عشرہ میں کسی تاریخ ایک جلوس ذوالجناح کا بھی ہونا چاہیئے جو قلب حسین کے عزاخانے سے کنندہ میر کے عزاخانے تک جائے انہوں نے کہا کہ اہل سنت کی مخالفت کا خوف ہے اگر درخواست پر ان کے دستخط ہو جائیں تو حکومت سے منظوری مل جائے گی۔ میری مجالس میں بہ کثرت اہل سنت حضرات آیا کرتے تھے اور میرے سے خوش

تھے لہذا چند حضرات کے ساتھ اس علاقے کے سربرآوردہ حضرات کے پاس میں گیا بحمداللہ سب نے بخوشی دستخط کردئے اور یہ رقوم کو جلوس برآمد ہونے لگا۔ جس میں اطراف وجوانب کے شیعہ دور دور سے شرکت کے لئے آتے تھے۔ یہ ٹیپا لڑکا خاص، جلوس بن گیا اس کا تمام اہتمام خلیفہ فیملی کی طرف سے ہوتا تھا۔

خلیفہ ہادی حسن صاحب مرحوم کا اچانک انتقال ہوگیا ان کے باقیات الصالحات میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں ایک لڑکی پہلی بی بی سے تھی باقی تین موجودہ بیگم سے۔ بڑے لڑکے خلیفہ سید سعید حسن تھے جن کا انتقال اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں ہوا دوسرے صاحبزادے خلیفہ سید اقبال حسن بحمداللہ بقیدِ حیات ہیں مگر دائم المریض ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ تیسری بیٹی ثریا سلطانہ سلمہا ہیں۔ جب میں پہلے سال ٹیپا لگیا تھا تو اس لڑکی کو جس کی عمر چھ سات کی تھی میں نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا بحمداللہ یہ رشتہ آج تک قائم ہے۔ ثریا کو مجھ سے وہی محبت ہے جو ایک بیٹی کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ اس لڑکی کی شادی خلیفہ محمد ہاشم صاحب مرحوم کے بھتیجے خلیفہ سید سعادت حسین صاحب کے ساتھ ہوئی۔ بحمداللہ دونو بقیدِ حیات ہیں۔ ثریا سلمہا کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں منجھلی لڑکی میمونہ بیگم کی شادی میرے لڑکے سید شمیم الحسن سے ہوئی۔ اس طرح یہ روحانی بیٹی میری سمدھن بھی بن گئی۔

خلیفہ ہادی حسن صاحب کی موت نے میرے دل کو بری طرح کچلا تھا۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا میں نے اپنے دل کی تڑپ میں جو مرثیہ لکھا وہ حسب ذیل ہے۔

مرثیہ خلیفہ ہادی حسنؒ

خاکِ پنجاب تری صحبت میں ہوئی فخرِ جہاں
شہرۂ کشش ہے تو میانِ کشورِ ہندوستاں

تیری کانِ پُر ضیا نے وہ کیے جوہر عیاں
جن کا ثانی آج تک لا یا نہیں دورِ زماں

صوبۂ پنجاب میں تو جائے مردم خیز تھی
کثرتِ اہلِ خرد تجھ میں عجب انگیز تھی

سرزمیں نے تیرے سلماں کی گئے ایسے لعل
آج تک عصمت سرا ہیں جن کے اربابِ کمال

ذی خرد ذی فہم عالی نفس اور روشن خیال
اپنی اپنی ذات میں تھے بے نظیر و بے مثال

حل کیے نکتے وہ ان کے ناخنِ تدبیر نے
دی صدا صد مرحبا کی عقلِ خردہ گیر نے

چھپ نہ جاتا ہو کمالِ ذات ہو کر آشکار
کھینچ لیتا ہے نظر کو آپ ذرۂ تابدار

چھپ نہیں سکتے ہیں ایسے کاملانِ روزگار
قدر دانوں کی نظر پر چڑھ گئے انجمِ کار

جوہری نے جوہرِ ذاتی کو دیکھا دور سے
جانچ ڈالا تارِ نظر ہر گوہرِ پُر نور سے

جب کسوٹی پر طلائے ذات کو پایا کھرا
پھر تو قلبِ مشتری پر اور سکہ جم گیا

جس قدر فضل و شرف ہوتا گیا جلوہ نما
اتنا ہی اہلِ خرد کا مرتبہ بڑھتا گیا

کیا بتاؤں اپنے علم و فضل سے کیا کیا بنے
مختصر یہ ہے اتالیق مہاراجہ بنے

اس طرح حاصل ہوا ان کو خلیفہ کا خطاب — گویا تھا یہ اس کتابِ دل کشا کا ایک باب
پھر تو داخل ہو گیا برجِ شرف میں آفتاب — اور لگی پڑنے ریاست کی نگاہِ انتخاب

قدردانی دیکھ کر ان کی بھی ہمت بڑھ گئی
تابشِ خورشید سے ذرّوں کی عظمت بڑھ گئی

اس تعلق کی بنا پر چھٹ گیا ان سے وطن — اور پٹیالہ بنا ان تازہ پھولوں کا چمن
جب ہٹا تحویلِ برجی سے یہ مدت کا گہن — پوری تابش سے ہوا خورشیدِ دانش ضو فگن

بختِ نیکو فال سے پھر تو امارت مل گئی
انتہا یہ ہے کہ کرسی وزارت مل گئی

اس صدف کے پانچ دُر تھے زینتِ تاجِ شہی — ان عملی بندوں سے پُر تھا بازوئے شاہنشہی
شہرہ کش ان کی وفاکیشی قیامت تک رہی — داد لیتا تھا سرِ بازار ذوقِ آگہی

نقش تھیں فرماں روا کے دل پہ ان کی خدمتیں
ابرِ رحمت کی طرح چھائی ہوئی تھیں برکتیں

سلطنت کے وہ اہم پیچیدہ مشکل مسئلے — پست جن سے ہو گئے اہلِ خرد کے حوصلے
وہ انہی کے ناخنِ تدبیر سے ایسے کھلے — دابے انگشتِ حیرت سب نے دانتوں کے تلے

ابرِ تیرہ جس جگہ دامن کشِ اطراف تھا
ان کے جاتے ہی قدم دیکھا تو مطلع صاف تھا

ان کو حاصل تھا سیاسیات میں ایسا کمال — جس کی ڈھونڈے سے نہیں ملتی ہے دنیا میں مثال
ایسے شاطر کا بساطِ دہر میں ملنا محال — لاکھ چالیں غیر کی وہ ان کی دی اک چال

تھمنے والے جو نہ تھے ہرگز کسی کی روک سے
رُک گئے سیلاب وہ ان کے قلم کی نوک سے

ذات پر ان کی مہاراجہ کو تھا یہ اعتماد | بے تامّل ان کی ہر اک رائے پر کرتا تھا صاد
گو کہ جلتا تھا حسد سے خاندانِ بے سواد | پر مقابل میں کبھی ان کے نہ بر آئی مراد
وہ فضیلت اور شرف کوئی دکھا سکتا نہ تھا
ان کی خدمات ریاست کو مٹا سکتا نہ تھا

وہ ترقی ریاست میں تھے کوشاں اس قدر | رات دن ہوتے تھے ان کے اس تردد میں بسر
کھل گئے کوشش سے ان کی دخل کے مسدود در | شعبے پر شعبے ہوئے جاری برائے کسبِ زر
ہو گیا گنجینۂ شاہی کا صد گونہ وقار
رفتہ رفتہ ایک سے بڑھ کر ہوئی دولت ہزار

جبکہ بیرونی دُوَل سے آ کے پڑتا کوئی کام | ان کی صائب رائے سے ہوتا تھا اس کا انصرام
جس سفارت پر گئے آئے نہ بے نیلِ مرام | عاقلانِ دہر سے ٹوٹا نہ ان کا انتظام
منہ سے جو کچھ کہہ دیا کر کے اسے دکھلا دیا
کر کے جو دکھلا دیا اس کا سبب بتلا دیا

آہ کس کے کر حسنِ خصائل کا بیاں | گنگ ہے توصیف میں ان کی زبانِ ساحراں
وہ وزیرِ دولتِ پٹیالۂ عالی نشاں | وہ مدبر ملک کا اور وہ امیر حکمراں
پاکباز و پاک باطن ذی حسب والا نسب
جس کو تھا سی آئی ای خان بہادر کا لقب

ان کے علم و فضل پر شاہد ہے وہ نادر کتاب | جس کا لب لب ملحدوں کو ہے منہ توڑ جواب

بہترین خدمت ہے وہ اسلام کی بے ارتیاب ۔۔۔ زندگی اس سے مصنف کی ہے تا یوم الحساب

بند دروازہ ہوا منکر کی قال و قیل کا

[illegible]

بالیقیں اس سے عیاں اعجاز ہے تنزیل کا

ذوقِ علمی سے مرتب وہ کتب خانہ کیا ۔۔۔ جس سے بحرِ علم و فن کا اک تلاطم تھا بپا

وقفِ چشمِ اہلِ دانش تھا وہ گنجِ بے بہا ۔۔۔ شائقانِ علم کا رہتا تھا اک تانتا بندھا

پُر تھیں ہر اک علم کی تصنیف سے الماریاں

اور وہ ان کی چمکتی جلدوں کی تیاریاں

غدر کے ایام میں جب تھی بغاوت آشکار ۔۔۔ اور باغی کر رہے تھے چار جانب لوٹ مار

یہ ریاست کی طرف سے لے کے فوج آ ملے ۔۔۔ چل دئے سرکار کی جانب سے سوئے کارزار

جب کہ پھر سے ہند پر انگریز کو قبضہ ملا

ان کو خدمت کے صلے میں خلعت و تمغہ ملا

اہلِ ایماں کے لئے یہ ذات تھی صد مغتنم ۔۔۔ ایک اس دم سے تھے وابستہ ہزاروں پاک دم

اہلِ حاجت کے لئے وہ تھا سدا ابرِ کرم ۔۔۔ ان کے سایہ میں جو آیا ہو گیا بے رنج و غم

دل سے کرتے تھے جو ہو سکتی تھی خدمت قوم کی

اس باوجودِ پاک طینت سے تھی عزت قوم کی

اب وہ اس خاندان کی دوسری ممتاز فرد [illegible] ۔۔۔ وہ مشیرِ ملک، اور خانِ بہادر نیک مرد

ایسے ملتے ہیں کہاں قوموں کو اہلِ حل و عقد ۔۔۔ جس نے دیکھے ہوں زمانے کے بہت سے گرم و سرد

آنریبل میر منشی، ممبر کونسل ہوئے

جتنے اعزازی لقب تھے ان کو سب حاصل ہوئے

حق نے اپنے فضل سے بخشا تھا وہ روشن دماغ ۔۔۔ گل تھا جسکے سامنے ارباب دانش کا چراغ
عقل نکتہ رس کہ تھی بات کا ایسا سراغ ۔۔۔ جس کو سن کرتے تھے بلبل حکومت باغ باغ

رخ کیا جس سمت وہ کارِ حکومت ہو گیا
ان کی جد و جہد سے پٹیالہ جنت ہو گیا

اپنے سارے خاندان کا سید و سردار تھا ۔۔۔ وہ سیاسی انجمن کا ایک مرد کار تھا
اکمل افراد تھا فخر اولی الابصار تھا ۔۔۔ دولتِ پٹیالہ کا اک نامور سردار تھا

اس نے توسیع حکومت میں کئے ہیں وہ وہ کام
مدتوں تک بھولنے والا نہیں ہے اس کا نام

فرد سوئم اس قبیلے کی تھی وہ روشن ضمیر ۔۔۔ جس کا زہد و اتقا تھا بے مثال و بے نظیر
مولوی پاک باطن زاہد عزلت پذیر ۔۔۔ عالم نیکو عمل جود و سخاوت میں شہیر

اس کے عادات و خصائل سے یہ چلتا تھا پتا
جامۂ انسان میں ہے اک ملک جلوہ نما

اس کو روحانی ریاضت میں وہ حاصل تھا کمال ۔۔۔ ڈھل گئے تھے نور کے سانچے میں عادات و خصال
قوم کی عسرت نصیبوں پر تھا شفقت کا خیال ۔۔۔ دل تڑپ جاتا تھا اس کا جب کوئی کرتا سوال

چارہ سازِ بے نوا حاجت برآرِ خلق تھا
مایہ دارِ مکرمت تھا افتخارِ خلق تھا

وہ ریا و مکر سے آزاد تھا نخوت سے دور ۔۔۔ اس کی طینت میں تھی آمیزش مکر و غرور
ایک حالت تھا بر و باطن کی تھی بین الامور ۔۔۔ پھوٹ نکلا تھا صفائے قلب کا چہرہ پہ نور

پیشوا تھا وہ طریق سید لولاک کا
ذاکر بے مثل تھا آل رسول پاک کا

فرد چوتھی اس قبیلے کی تھی وہ نیکو خصال — جو رہا مشہور ہو کر شاعر روشن خیال
فکر عالی، طبع موزوں، اور بھر حسن خیال — لائے گا کوئی کہاں سے ہو گیا امر محال

ہو چکے کان سخن میں ایسے جوہر اب کہاں
شاعری نازاں ہو جس پر وہ سخنور اب کہاں

ان کو تھی تاریخ گوئی میں مہارت اس قدر — بے تامل مصرعۂ تاریخ کہتے وقت پر
لوگ کرتے سب فرمائشیں شام و سحر — اور نکلتے جاتے تھے کان جواہر سے گہر

نقش ہیں اب تک جو تاریخیں در و دیوار پر
دیکھتے ہیں چشم حیرت سے انہیں اہل نظر

پانچواں اس باغ کا تھا وہ گل رنگیں ادا — جس کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو گیا
تا بہ لندن اس کے علم و فضل کا چرچا ہوا — ہند کی سرکار عالی میں اسے منصب ملا

ذات پر اس کی ہوا اعزاز و شاں کا خاتمہ
اس گل تر نے کیا اس خانداں کا خاتمہ

ان بزرگوں کی کہاں تک کیجئے مدح و ثنا — ان کے اعلیٰ کارناموں کی نہیں کچھ انتہا
مدتوں ان کے حشم کا ملک میں ڈنکا بجا — پر نگاہ غور سے دیکھا تو آخر کچھ نہ تھا

آہ خوابے بود آنچہ دیدم و باقی نماند
وا دریغا آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

شعبدہ باز فلک کی چل گئی آخر کو چال — ہو گیا پائے خزاں سے باغ سارا پائمال
پھول شاخوں سے گرے مرجھا گیا اک اک نہال — ہو گئے بے راز والے ہرز والے را کمال

خاک میں جاہ و حشم سارا ملایا موت نے
جو نہ دیکھا تھا وہ آنکھوں سے دکھایا موت نے

مرنے والے شان و شوکت کو دکھا کر چل دیے　　بلبلان خوشنوا نغمے سنا کر چل دیے
علم و فضل و جود کے دریا بہا کر چل دیے　　نقش الفت اپنا ہر دل پر جما کر چل دیے
بزم والے اٹھ گئے محفل میں سنسانی ہوئی
مرکز صد خامشی بزم سخندانی ہوئی

سرفرازان وطن خاک وطن سے اٹھ گئے　　نونہالان چمن صحن چمن سے اٹھ گئے
انجمن کے صدر صدر انجمن سے اٹھ گئے　　غیرت لعل یمن کان یمن سے اٹھ گئے
فخر جن پر قوم کو تھا وہ بشر رخصت ہوئے
ملک سونا ہو گیا اہل ہنر رخصت ہوئے

ان کا ماتم قوم شیعہ کا ہے ماتم بیگماں　　مغتنم تھیں قوم کو یہ نام آور ہستیاں
اہل ایماں کے لئے تھا فیض کا چشمہ رواں　　مذہب حقہ کو تھی ان سے بڑی تاب و تواں
صاحب علم و یقیں جود و سخا والے تھے وہ
آل کے سچے فدائی اور خدا والے تھے وہ

ان کے مرنے کا ابھی ہر دل پہ باقی تھا اثر　　کر دیا یکتا سخن نے بھی جو رہ پر باندھی کمر
تھے خزاں دیدہ چمن میں چند گلشن کے ثمر　　ان پہ بھی ظالم نے ڈالی انتخابی اک نظر
سب پھلوں میں جو رسیلا پھل تھا توڑا ہاتھ کو
موت نے ناوقت آ کر باغ لوٹا ہائے ہائے

تھی فقط اک ذات جس سے دل کو ڈھارس تھی کمال　　وہ دلا دیتا تھا کچھ اپنے بزرگوں کا خیال
موت اس کی کر گئی کل خاندان کو خستہ حال　　مرنے والا ساتھ اپنے لے گیا جاہ و جلال
محفلیں برہم ہوئیں موقوف صحبت کل ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی آج وہ بھی گل ہوئی

اسکے مرنے نے بپا کر دی قیامت ہائے ہائے — بے مکیں کے رہ گیا قصرِ وزارت ہائے ہائے
دل کے ٹکڑے کر گئی ہے اس کی رحلت ہائے ہائے — پھر رہی ہے آنکھوں میں وہ روکش صورت ہائے ہائے

آہ اک چشمِ زدن میں قصر سونا کر گیا
لوگ تکتے رہ گئے اور مرنے والا مر گیا

صدرِ مجلس اٹھ گیا مجلس میں وہ رونق کہاں — اب نظر آتا نہیں کوٹھی کا پہلا سا سماں
گو کہ کہنے کے لئے موجود ہے ہر شے یہاں — ہیں مگر بدلے ہوئے اسکے زمین و آسماں

گوشے گوشے میں ہے حسرت کا سماں چھایا ہوا
جس کو دیکھو پھرتا ہے تیرِ الم کھایا ہوا

دید نی ہے دوستو یہ گردشِ چرخِ کہن — بات کہتے یوں بھی لٹ جاتا ہے دنیا میں چمن
دو منٹ پہلے تھی جس گھر میں خوشی کی انجمن — دو منٹ پیچھے وہی گھر بن گیا بیت الحزن

تخت اُٹھا اور شکل کا مرانی مٹ گئی
سامنے آنکھوں کے تصویرِ جوانی مٹ گئی

آہ وہ چشم و چراغِ خانداں ہادی حسن — یادگارِ عز و شانِ رفتگاں ہادی حسن
اشرفِ سادات میرِ کارواں ہادی حسن — افتخارِ قوم سارے گھر کی جاں ہادی حسن

اس کی رحلت الغرض پیر و جواں کی موت ہے
بلکہ یوں کہیے کہ سارے خانداں کی موت ہے

سرنگوں ہے طرۂ دستارِ حشمت وا دریغ — اڑ گیا مغرب میں مہرِ جاہ و حشمت وا دریغ
بے ضیا ہونے لگا نجمِ سعادت وا دریغ — دل شکستہ ہو گئی ہے اک جماعت وا دریغ

جس سے وابستہ تھا امیدوں کا رشتہ مر گیا
وہ خلیفہ فیملی کا کاج کرتا مر گیا

کام ہیں بگڑے ہوئے اپنے بنائے آئے کون — دشمنوں کے وار چلتے ہیں بچائے آکے کون
اب محرم میں صف ماتم بچھائے آئے کون — جوش اس کا سا مجالس میں دکھائے آکے کون

زخم دل کا جو مداوا تھا وہ مرہم ہی نہیں
اب تو عالم اور ہے پہلا سا عالم ہی نہیں

اسی خاندان کی ایک ممتاز فرد عالم باعمل زاہد بے ریا مولوی با صفا پیکر حسن اخلاق جناب مولانا خلیفہ سید محمد ہاشم صاحب قبلہ صاحب کتاب "ناموس اسلام" ہر دو جلد تھے۔ مرحوم بڑے پائے کی یہ دو نو کتابیں لکھ گئے۔ بالخصوص حصہ ۲ میری رائے میں یہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی اس کتاب میں کوئی حوالہ بغیر اصل ماخذ کو اپنی آنکھ سے دیکھے نہیں لکھا۔ حصہ دویم کے مختلف اوراق کو جو مرحوم نے لکھے تھے ترتیب دینے کا شرف مجھ کو حاصل ہوا۔

خلیفہ صاحب کی مدح و ثنا میں میری زبان قاصر ہے۔ بڑی مقدس ہستی تھے جوانی میں ان کی بی بی کا انتقال ہو گیا تھا مگر دوسری شادی نہ کی اور بقیہ عمر عبادتِ خدا میں بسر کی دو یتیم بھتیجوں (خلیفہ سید سعادت حسین اور خلیفہ محمد کاظم) کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان ہی کو اپنی صلبی اولاد کی طرح بڑے ناز و نعم سے پالا۔

ان کی کوٹھی مومنین کے لئے ایک سرائے تھی جس کو لوگ ہوٹل المومنین کہتے تھے جو باہر سے آتا وہ ان ہی کے یہاں مہمان ہوتا اور جب تک چاہتا رہتا مہمان نوازی میں کوتاہی نہ ہوتی۔ جب میں عشرہ محرم میں پٹیالہ جاتا

تو روزانہ وقت شام ان کی کوٹھی پر جاتا اور بھی لوگ آجاتے تھے نہایت پُر لطف صحبتیں رہتیں۔ خلیفہ صاحب مرحوم امام حسین علیہ السلام کے سچے عاشق تھے۔ ۱۱ محرم سے ۱۰ ربیع الاول تک اپنی کوٹھی میں وقت شب مجلس کراتے تھے۔ مجھ سے ان مرحوم کو بڑی عقیدت تھی۔ ماہ ذی قعد ہی سے خطوط میں استفسار کرنے لگتے آپ کب آئیں گے۔ دس پندرہ روز پہلے تشریف لائیے۔ مگر میں اسکول کی ملازمت کی وجہ سے ہر سال اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہتا۔ جس گاڑی سے میں پٹیالہ پہنچنے والا ہوتا وہ کار کے ڈرائیور سے کہہ دیتے کہ مولانا کو پہلے یہاں لانا۔ میرے انتظار میں اکثر وہ کوٹھی کے صحن میں ٹہلتے ہوتے جب میں کار سے اترتا تو بڑے تپاک سے معانقہ کرتے۔ روانگی کا وقت ہوتا تو آنکھوں میں آنسو ہوتے۔

ایک بار مجھ سے فرمائش کی کہ آپ جو مضامین یہاں پڑھا کرتے ہیں ان کو ایک کتاب میں جمع کر کے چھپوا دیجئے۔ تاکہ دیگر مومنین بھی اس سے فائدہ حاصل کریں میں نے ان کے اس حکم کی تعمیل میں کتاب "مصباح المجالس" لکھی۔ جب چھپ کر آئی تو میں نے ان کی خدمت میں بھیج دی۔ جب میں محرم میں پٹیالہ گیا تو فرمانے لگے مولانا وہ بات پیدا نہ ہوئی۔ میں نے کہا قبلہ جب منبر پر بیان کرتا ہوں تو آپ جیسی قدردان ہستی میرے سامنے ہوتی ہے جسے دیکھ کر مضامین اُبل پڑتے ہیں اور جب یہ کتاب لکھ رہا تھا تو میرے سامنے کوئی نہ تھا نہ کہ آپ۔ ۲۰ سال مجھے اس مقدس ہستی سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا افسوس ہے کہ تقسیم ملک کے وقت سکھوں کے ہاتھوں پٹیالے کے مسلمانوں

پر بڑے وحشیانہ مظالم ہوئے۔ خلیفہ صاحب کی کوٹھی پر بھی حملہ ہوا۔ محلہ کی تمام عورتیں اور کچھ مرد جوان کی کوٹھی میں جمع تھے انتہائی بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔ مگر خلیفہ صاحب اور ان کے خاندان والے معجزانہ طور پر بچ گئے۔ اور کیمپ کی انتہائی تکالیف برداشت کرنے کے بعد لٹے گھٹے لاہور پہنچے۔ اور ایف روڈ کی اس کوٹھی میں جہاں اب مجالس ہوتی ہیں قیام کیا۔ اور ۳ محرم ۱۹۴۸ء اسی کوٹھی میں انتقال کیا۔ میں اِس زمانہ میں مرادآباد تھا ان کی موت کا جو صدمہ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔

کانپور سے میری روانگی

جب تھیوسوفیکل کالج اور اسکول ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے تو بحیثیت ہیڈ مولوی میرا تقرر پارکر ہائی اسکول مرادآباد میں ہو گیا۔ مرادآباد میرے وطن کا ضلع تھا اور بذریعہ ریلوے لائن صرف ۱۹ میل دور تھا۔ میرے لئے اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہو سکتی تھی کہ اپنے وطن سے قریب ہو جاؤں

احباب کانپور پر میری جدائی بہت شاق تھی تقریباً پندرہ روز دعوتوں کی پارٹیوں کا سلسلہ رہا وداعی جلسے ہوئے۔ تقریریں ہوئیں۔ ایڈریس دیئے گئے نظمیں لکھی گئیں۔ بہت سے احباب رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے۔ بغلگیر ہوئے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی تری تھی۔ میرے دل پر بھی ان کی مفارقت بہت

شاق تھی اور آنسوؤں کا جواب آنسوؤں سے دے رہا تھا۔

میری ملازمت کا تیسرا دور

جولائی ۱۹۳۰ء میں مرادآباد آ گیا اسی سال میری دوسری شادی ہوئی اور اسی سال میں نے اپنے والد کی جائداد فروخت کی اور رقم کو دونوں بھائیوں نے بحصہ مساوی تقسیم کر لیا۔ میں مرادآباد میں تقریباً تین سال رہا چونکہ وطن قریب تھا لہذا ہر ہفتہ امروہہ جانا ہوتا تھا۔ میرے ہم وطن سید مظاہر حسن صاحب مختار (وکیل) محلہ سنبھلی دروازہ میں رہتے تھے۔ میں نے بھی ان کی قربت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی محلہ میں مکان کرایہ پر لیا۔ مظاہر حسن صاحب ایک اچھے قانون داں تھے ان کی مختاری اس زمانہ میں خوب چل رہی تھی۔ مذہبی معاملات سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور معلومات بھی خاصی تھی۔ مناظرہ کرنے میں انھیں بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ جو بھی موکل ان کے ہتھے چڑھ جاتا وہ اس سے مذہبی چھیڑ چھاڑ ضرور کرتے چونکہ یہ امر ان کے پیشے کے خلاف تھا لہذا اس سے ان کو مالی نقصان بھی پہنچا۔ مگر انہوں نے اپنے رویہ کو نہ بدلا۔ انہیں میرا اور ان کا ملنا روزانہ ہی ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں تھانہ مغلپورہ میں سید ذاکر حسین صاحب ضلع لکھنؤ کے رہنے والے انچارج تھے۔ بڑے مرد مومن اور مذہبیات سے دلچسپی رکھنے والے ان سے بھی ہم دونوں کے تعلقات ایسے بڑھے کہ ہفتہ میں ایک دو بار ملنا جلنا ضرور تھا۔

تاریخ امروہہ کا واقعہ

محمود احمد عباسی مصنف کتاب "خلافت معاویہ ویزید" جو اب پاکستان میں ہے امروہہ کا رہنے والا ہے۔ اس نے امروہہ میں تاریخ امروہہ لکھنے کا اعلان کیا اور بھولی بھالی سادات کو بڑے سبز باغ دکھائے کہ میں آپ لوگوں کے آباء و اجداد کے کارناموں کا اس میں مفصل ذکر کروں گا لہذا اس کتاب کی طباعت میں آپ لوگ میری مدد کریں۔ سادات نے دھوکہ کھا کر بڑی بڑی رقمیں دیدیں اور شاہی فرامین بھی سپرد کرتے جو پھر غالباً واپس ہی نہ ملے۔

یہ تاریخ تین جلدوں میں لکھی گئی جس میں شیعوں کی خوب خبر لی کوئی شجرۂ نسب بغیر مجروح کئے نہ چھوڑا۔ ائمہ کو کنیز زادہ لکھ کر توہین کی شیعوں میں دشمن خصلتیں یہودیوں کی لکھیں۔ اس کتاب کے شایع ہوتے ہی شیعوں میں ہل چل مچ گئی اور اس کے جواب کی فکر ہوئی لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ہم نے اپنے نسب کو صحیح ثابت کردیا اور اس کی خرافات کا دندان شکن جواب بھی دیدیا جیسا کہ ہم ہمیشہ کرتے رہے ہیں تو اس سے عباسی پر کیا زد پڑیگی۔ کوئی بات ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ بھی تلملا جائے اور جس طرح اس نے ہمارے دل و جگر پر خنجر چلائے ہیں اس کا کلیجہ بھی یوں ہی چھید دیا جائے۔

اس کی طرف سب سے پہلے قدم اٹھانے والے سید منظر حسن صاحب تھے جو ہاتھ دھو کر عباسی کے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد چند ثبوت اس کے فراہم کئے کہ عباس عبدالمطلب کے فرزند تھے بلکہ حرام کے تھے۔ جناب عبداللہ و ابو طالب کی والدہ ماجدہ فاطمہ مخزومیہ کے ساتھ نتیلہ نامی جو کنیز آئی تھی یہ عباس اس

بطن سے تھے چونکہ خانۂ عبدالمطلب میں پرورش پائی تھی لہٰذا عرب کے دستور کے مطابق
ان کو فرزند عبدالمطلب کہا جانے لگا۔ اس سلسلے میں ان مرحوم نے کئی کتابچے لکھے۔
کئی کتابیں لکھیں جیسے نسب نامۂ عباسیہ۔ خاتمہ بالخیر۔ اللہ کا ڈنڈا۔ آریخ تھو۔ ڈھول کا
پول۔ ان کتابوں میں انہوں نے عباسی کے نسب نامے پڑھ کاری ضربیں لگائی تھیں کہ چیخ اٹھا
اور امروہہ سے بھاگ کھڑا ہوا اس سلسلے میں ایک کتاب میں نے بھی لکھی "ید اللّٰہی طمانچہ"
جو فیاض حسین مرحوم کے نام سے چھاپی گئی اس میں متعدد ثبوت اس کے دئے گئے
کہ عباس پسر عبدالمطلب نہ تھے۔ مولوی محمد عسکری صاحب نے "آفتاب صداقت"
لکھ کر یہ ثابت کیا کہ عبداللہ بن عباس شیعہ تھے۔

شیعہ آرٹ اسکول

زمانۂ قیام مرادآباد میں میں نے امروہہ میں ایک شیعہ آرٹ اسکول
کھولنے کی تجویز پیش کی بحمداللہ سب نے اس خیال کی تائید کی اور وصولی چندہ
کا کام شروع کر دیا گیا۔

یہ کام ایک کمیٹی کے تحت ہوا جس کا میں صدر تھا مقصد یہ تھا کہ ہمارے
نوجوان جو بے کاری میں اپنا عزیز وقت گزار رہے ہیں کسی صنعت کے ماہر
ہو کر روزی کمانے کے قابل ہو جائیں۔

باتفاق آراء یہ طے پایا کہ کپڑا بننے کا کام سکھایا جائے۔ میں نے اپنی

کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ وصولی چندہ کا کام شروع کیا اور بحمد اللہ چند ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد تقریباً دو ہزار روپیہ جمع کر لیا گیا۔ محلہ دربار کلاں میں ایک مکان کے اندر اس کام کا افتتاح ہوا۔ چار لوم لگائے گئے۔ ہوشیار جلاہے کام سکھانے کے لئے نوکر رکھے گئے۔ پانچ لڑکوں نے داخلہ لیا۔ ان کا وظیفہ بھی مقرر کیا گیا کچھ سوزی کپڑا بھی بنا لیا۔ مگر بدنصیبی سے بعض سیدوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کام سیکھ کر ہم جلاہے کہلانے لگیں گے اور قوم بنگاہ حقارت دیکھے گی نہ کوئی ہماری لڑکی لے گا نہ دے گا۔ یہ پروپیگنڈا شروع ہوا تو لڑکے رفتہ رفتہ سب کام چھوڑ کر چلے گئے اور روپیہ ختم ہونے سے پہلے اسکول ختم ہو گیا۔

امام المدارس کیلئے میری کوشش

امام المدارس امروہہ جو بحمد اللہ اب انٹر کالج ہے میرے قیام مرادآباد میں مڈل اسکول تھا اس کو ہائی اسکول بنانے کی فکر تھی لیکن یہ منصوبہ اس وقت پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک مدرسہ کے لئے عمارت نہ ہو اب تک یہ مدرسہ محلہ بنگلہ کے امام باڑہ میں تھا۔ مولوی سید مجتبیٰ عرف مولوی چاند صاحب اس کے منیجر تھے اور اس کو ہائی اسکول بنانے کے لئے چندہ فراہم کر رہے تھے۔ شیعہ آرٹ اسکول کے سلسلے میں وہ میری انتھک کوششوں کو دیکھ چکے تھے لہذا انہوں نے مجھے اس طرف توجہ دلائی چنانچہ ان کے دوش بدوش کئی ماہ میں نے یہ

خدمت انجام دی۔ میں مرادآباد سے دوسرے روز شام کو امروہہ آتا تھا اور آتے ہی کام شروع کر دیتا تھا اتوار کا پورا دن اسی میں صرف ہوتا تھا۔ بحمد اللہ اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔

مُرادآباد کی ایک مسجد کی تعمیرِ نو

جب میں محلہ مغلپورہ اول میں کرایہ پر مکان لے کر رہا تو معلوم ہوا کہ اس محلہ کی شیعہ مسجد ویران ہے احاطہ شکست ہونے کی وجہ سے رات کو اس میں کتے گھس جاتے ہیں مجھے اس کا بڑا قلق ہوا منشی حمید حسن صاحب نے جو پاکستان آ چکے ہیں مجھے اس کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اگر آپ جماعت سے نماز پڑھانے لگیں تو یہ مسجد آباد ہو جائے میں نے منظور کر لیا۔ روزانہ مغربین کی نماز میں وہیں پڑھتا تھا اس محلے کے تمام شیعہ صاحبان وہاں آنے لگے۔ میں نے چندہ کر کے اس کی مرمت کرائی پھر ایک درجہ اور بنوایا جس سے مسجد کی رونق دوبالا ہو گئی ماہ صیام میں افطار بھی ہونے لگا۔ منشی حمید حسن صاحب نے جن کا مکان مسجد کے قریب تھا اس سلسلے میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ افسوس کہ میرے پاکستان آنے کے بعد وہ پھر ویران ہو گئی۔

مسٹر براؤن کی تعلیم

سید ابو محمد صاحب آگرہ کے رہنے والے مراد آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی ایک دن انہوں نے کہا بریلی کے اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر ایف جی براؤن یہاں ٹریننگ کرنے آئے ہیں وہ ایران میں سفیر بن کر جانا چاہتے ہیں اس لئے فارسی پڑھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پڑھا دیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ ہفتہ میں صرف تین روز ایک ایک گھنٹہ پڑھیں گے۔ میں نے منظور کر لیا۔ اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا مسٹر براؤن بڑے خوش اخلاق اور نیک طبیعت انسان تھے اردو بھی خاصی بولتے تھے وہ بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گئے ایک روز کہنے لگے فارسی کی گرامر جو آپ مجھے پڑھاتے ہیں وہ مجھے پسند نہیں آپ نسفیلڈ انگریزی گرامر کی طرز پر لکھ دیں تو اچھا ہو میں نے کہا بہتر میں کوشش کرتا ہوں ٹریننگ کرنے کے بعد مسٹر براؤن بریلی چلے گئے اور وہاں کے کلکٹر ہو گئے۔ میں نے تین چار ماہ محنت کر کے تہذیب القواعد کے نام سے فارسی گرامر لکھ دی جس کو رام دیال اگروال آف الہ آباد نے چھپوایا۔ جب چھپ کر میرے پاس آئی تو میں اسے لے کر بریلی گیا۔ براؤن دیکھ کر بہت خوش ہوئے مجھ سے کہا اگر آپ اسے ہائی اسکول کے فارسی کورس میں داخل کرا دیں تو آپ کا احسان ہوگا چونکہ اس کتاب کا ڈیڈیکیشن ان ہی کے نام سے تھا لہذا ان کو دلچسپی ہوئی اور ان کی کوشش سے یہ کتاب داخل نصاب ہو گئی اور مجھے اس سے کافی فائدہ ہوا جب میں رخصت ہونے لگا تو صاحب نے دو سو روپیہ کا چیک بطور میری محنت کے صلہ کے دیا۔

کوہستانی سفر

خلیفہ ہادی حسن صاحب کی ایک کوٹھی سولن پہاڑ پر بھی تھی خلیفہ صاحب ہر سال کہتے تھے کہ میں گرمی کا موسم ان کے ساتھ پہاڑ پر گذاروں مگر مجھ جیسا عدیم الفرصت انسان اتنا وقت کہاں سے لاتا مگر میرے دل میں کوہستانی سلسلہ دیکھنے کی خواہش ضرور تھی میں کبھی پہاڑ پر گیا ہی نہ تھا خلیفہ صاحب کی زندگی میں تو موقعہ نہ ملا۔ ان کے مرنے کے تین چار سال بعد میں اس سفر کے لئے آمادہ ہوا۔ خلیفہ سعادت حسین اور ان کی بیگم کے ہمراہ سولن گیا۔ خلیفہ ہادی حسن مرحوم کی بیگم صاحب پہلے سے موجود تھیں ان ہی کی کوٹھی پر ٹھہرا تقریباً پندرہ روز کوہستانی علاقہ کی سیر کی اور خدا کی قدرت کے عجیب غریب کرشمے دیکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ معرفت الٰہی کے جو درس پہاڑوں پر ملتے ہیں میدانوں میں کہاں یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ نے اپنی زندگیاں پہاڑوں پر گزاریں کالکا سے کوہستانی سلسلہ میں ہوتی ہوئی جو ٹرین شملہ جاتی ہے وہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ اور دوسری طرف گہرے گہرے کھڈ۔ کئی جگہ چھوٹی بڑی سرنگیں بھی راستے میں ملتی ہیں۔ یہ انسانی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ جا بجا سے پہاڑوں کی چھاتی پھاڑ کر ان میں سے ریلوے لائن گزار دی ہے۔ سب سے بڑی بروک کی سرنگ ہے۔ جو کئی میل لمبی ہے۔ گرمی کے موسم میں پہاڑوں کا سماں قابل دید ہوتا ہے۔ بادل سر پر چھایا ہوا۔ ٹھنڈی

ہوا کے جھونکے کہیں برف گر رہی ہو کہیں چشمہ کا صاف شفاف پانی بہہ رہا ہو اخروٹ، خوبانی، شہتوت وغیرہ کے درخت چشمہ ساروں پر چھائے ہوئے ہیں یہ قدرت کا خوان لیتما ہے جس کا دل چاہے کھائے چشموں کا پانی سبحان اللہ موتی جیسا صاف برف جیسا ٹھنڈا۔ تقریباً پندرہ روز میں یہاں رہا۔ سولن سے بذریعہ کار ایک دن شملہ بھی گیا۔ یہاں کا سماں ہی کچھ اور ہے۔ میں تو جب تک رہا قدرت کی صناعیوں کے جلوؤں میں محو رہا اور سبحانہٗ ما اعظم شانہ کا ورد کرتا رہا۔

پارکر ہائی اسکول آدآباد

یہ اسکول امیتھا ڈسٹ مشن آف امریکہ کا تھا اس کے منیجر انڈین کرسچین مسٹر این جارڈن تھے جو بڑے ذی لیاقت انسان تھے۔ بالخصوص انگریزی زبان ان کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی اردو فارسی سے بھی انہیں لگاؤ تھا۔ شاعر تو نہ تھے مگر سخن سنج ضرور تھے بہت جلد میرا وقار ان کی نظر میں قایم ہو گیا۔ ان کو شعر کے لطایف و ظرایف بہت پسند تھے۔ اپنی تقریر میں ضرور ایک دو لطیفے سنا دیتے تھے جیسے میں نے ان کا مذاق معلوم کرکے ایک کتاب لطائف الشعرا لکھی۔ اور اس کا ڈیڈی کیشن ان ہی کے نام سے کیا۔ اسے پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

رفتہ رفتہ میرا وقار ان کی نظر میں اتنا ہوگیا کہ انہوں نے کبھی کسی ضرورت کیلئے مجھے اپنے آفس میں بلایا نہیں بلکہ خود میرے پاس چلے آتے تھے اسکول میں آئے دن جلسے اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے ان کی خواہش ہوتی تھی کہ میں کوئی نظم ضرور پڑھوں اس سلسلے میں بے شمار نظمیں مجھے لکھنا پڑیں۔

دو یا تین بار میری بیماری میں عیادت کے لئے میرے مکان پر گئے۔ ٹیچر کہا کرتے تھے جارڈن صاحب مولوی صاحب کی سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔

کرک شینک پرائز

جس زمانہ میں کانگریس انگریزی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی تھی مظفر نگر کی ایک حکومت پرست سوسائٹی نے اخباروں میں اعلان کیا کہ جو شخص انگریزی حکومت کی موافقت میں مضمون لکھے گا اور اس کا مضمون اول نمبر آئے گا تو اس کو دو سو روپیہ انعام دیا جائے گا اس کا نام کرک شینک پرائز ہوگا۔

کرک شینک اس ضلع کے کلکٹر تھے جارڈن صاحب کی خواہش ہوئی کہ میں بھی لکھوں چنانچہ چار صفحہ کا ایک مضمون میں نے جارڈن صاحب کی معرفت بھیجا چھ ماہ تک اس کے متعلق کوئی پتہ نہ چلا۔ جارڈن صاحب نے سوسائٹی کو لکھا جواب آیا کہ سات سو مضامین کے قریب آئے ہوئے ہیں ان کو پڑھا جا رہا ہے۔ عنقریب نتیجہ شائع ہونے والا ہے۔

پندرہ روز بعد میرے نام کا اعلان ہوا۔ مظفر نگر کے کلکٹر نے مجھے بلا کر یہ انعام دیا اور ایک سرٹیفکٹ بھی۔ جارڈن صاحب نے اس خوشی میں ایک جلسہ کیا اور میری ادبی خدمات کو سراہا۔

جوبلی پرائز

جارج پنجم کی سلور جوبلی کے سلسلے میں جارڈن صاحب کی خواہش ہوئی کہ میں ایک قصیدہ لکھوں جس کو مشن کی طرف سے بھیجا جائے اس پر حکومت کی طرف سے سو روپے کا اعلان تھا۔ میں نے ایک نظم لکھ کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ اس کو بھیجا۔ میرا یہ قصیدہ اول نمبر آیا اور حکومت کی طرف سے سو روپیہ انعام مراد آباد کے کلکٹر کی معرفت مجھے ملا۔ ان خدمات کی وجہ سے مشن کے ممبروں کی نظر میں میرا وقار بڑھتا چلا گیا۔

شمس العلماء کے خطاب کی تحریک

میری ادبی خدمات جارڈن صاحب کی نظر سے گذرتی رہتی تھیں لہٰذا ان کو خیال پیدا ہوا کہ شمس العلما کا خطاب مجھے ملے چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے کوششیں شروع کیں۔ کلکٹر صاحب مراد آباد سے مل کر میرا نام بھجوایا۔ ایک بار جب گورنر مراد آباد آئے تو وہ ان سے ملے گورنر نے وعدہ کر لیا لیکن چونکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اس لئے یہ معاملہ معرض التوا میں پڑا رہا اور وہ وقت آ گیا کہ انگریزی حکومت ہی تشریف لے گئی۔

ہیڈ ماسٹر سے جھگڑا

جس سال میں پارکر اسکول پہنچا تھا اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر چوپڑا تھے جو نہایت مہذب اور خلیق آدمی تھے کچھ عرصہ کے بعد وہ مر گئے اور ایک نوجوان بنگالی کرسچین ہیڈ ماسٹر ہو کر آیا۔ اسے ہیڈ ماسٹری کا چانس پہلی ہی بار ملا تھا نا تجربہ کاری کی بنا پر نا سزا حرکات اس سے صادر ہوتی رہتی تھیں اس اسکول کے اسٹاف میں دو شیعہ تھے۔ ایک میں دوسرے کندرکی کے سید رفیق حسین۔ اسکول میں مسلمانوں کے پانی

کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہندو سب کو پانی پلاتا تھا۔ جب تک صبح کا اسکول رہا زیادہ تکلیف نہ رہی لیکن جب دس بجے سے ہونے لگا تو چار بجے تک پیاسا رہنا تکلیف دہ ہو گیا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اسٹیشن کی مسجد سے جاکر پانی پی آتے تھے کوئی روک ٹوک نہ تھی اس نامعقول ہیڈ ماسٹر نے یہ آرڈر نکالا کہ اسکول کی باؤنڈری سے کوئی اسکول ٹائم میں باہر نہ جائے۔

اس صورت میں ضروری ہوا کہ ہمارے لئے پانی کا کچھ بندوبست ہو۔ چنانچہ میں نے ہیڈ ماسٹر پر اس ضرورت کا اظہار کیا۔ اس نے کہا علیحدہ انتظام کی ضرورت نہیں جیسے سب مسلمان مدرس اور لڑکے پیتے ہیں آپ بھی پیجئے۔ میں نے کہا میں شیعہ ہوں اس لئے میں مسلمان کے سوا اور کسی کا پانی نہیں پی سکتا۔ دوسرے جب اسکول میں ہندوؤں کے لئے پانی کا انتظام ہے تو کیا وجہ کہ مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔ اس نے نہایت بے اعتنائی سے کہا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں خاموش ہو کر چلا آیا۔ دوسرے دن سے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب پیاس لگتی کلاس چھوڑ کر مسجد میں پانی پینے چلا جاتا۔ ایک روز وہ چکر لگاتا میرے کمرہ کی طرف سے گزرا۔ مجھے نہ پاکر لڑکوں سے پوچھا مولوی صاحب کہاں ہیں انہوں نے کہا پانی پینے کہیں گئے ہیں یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔ جب میں واپس آیا تو اس نے بلایا اور سخت لہجے میں کہا آپ اوقات تعلیم میں اسکول سے باہر کیوں گئے۔ میں نے کہا آپ میرے لئے پانی کا انتظام نہیں کر سکتے میں پیاسا مر نہیں سکتا۔ مذہب چھوڑ نہیں سکتا۔ اس نے کہا آپ ایسے کٹر مذہبی ہیں تو اسکول میں آپ نے ملازمت کیوں کی میں نے کہا اگر میں یہ جانتا کہ آپ ایسے سخت دل ہیں کہ پانی پینے کو بھی منع کرتے ہیں

تو بے شک مجھے استعفا دیدینا چاہیئے تھا۔ میں ایسی نوکری پر ٹھوکر مارتا ہوں۔ میں ابھی استعفا لکھ کر لاتا ہوں چنانچہ میں نے لکھا چونکہ ہیڈ ماسٹر مسلمانوں کے لئے پانی کا انتظام نہیں کرتا اور ہندوؤں سے پانی پینے پر مجبور کرتا ہے۔ لہٰذا اس بنا پر میں استعفا دیتا ہوں۔

یہ لکھ کر میں اس کی میز پر ڈال آیا۔ اس نے خدا جانے کیا کیا لکھ کر جارڈین صاحب کو بھیج دیا۔ وہ میرے پاس آئے اور واقعہ پوچھا۔

میں نے اس کی گفتگو بیان کر کے کہا اگر ایک جگہ پانی کے لئے ہم کو دیدی جائے تو باقی انتظام ہم خود کر لیں گے۔ سیڑھیوں کے عقب میں جو چھوٹی سی کوٹھری ہے وہ ہمارے لئے کافی ہوگا انہوں نے اجازت دیدی۔ مسلمان لڑکوں نے چندہ کر کے ایک گھڑونچی اور تین گھڑے وہاں رکھ دئے اور اسکول کی طرف سے سقّے کا انتظام ہو گیا

اس انتظام کے بعد اس کو مجھ سے سخت عداوت ہو گئی وہ ضرور مجھے برخاست کرا کر رہتا مگر خیریت یہ ہوئی کہ اس کی کمزوریاں بہت جلد مشن پر واضح ہو گئیں اور ایک ہفتہ کے اندر ہی اس کا تبادلہ عمل میں آ گیا۔ یہ پانی کا انتظام میرے وہاں سے آنے تک باقی رہا۔

اس کے جانے کے بعد مسٹر ولسن ہیڈ ماسٹر ہو کر آئے۔ یہ ایک سلجھا ہوا اور تجربہ کار آدمی تھا اور محنت کا قدردان تھا۔ میرا نتیجہ چونکہ صد فی صد یا نوے پچانوے فیصد رہتا تھا اور میں اسکول کے وقت کا بڑا پابند تھا۔ لیٹ بہت ہی کم ہوتا تھا رخصت بھی کم لیتا تھا پڑھاتا بھی دل چسپی سے تھا اس لئے کلاس میں سب لڑکے اپنے سبق کو پورے شوق سے پڑھتے تھے اس لئے ولسن کی نظر میں بھی میری قدر تھی

وقت تھی، وہ استادوں کے سامنے میری فرض شناسی کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

میں نے اپنے کمرے کی دیواروں کو لڑکوں کی جنرل انفارمیشن کے لئے ایک انوکھے انداز سے وہ تمام چیزیں پینٹ کرادی تھیں جو ہمیشہ ہائی اسکول کے امتحان میں پوچھی جاتی ہیں، جیسے نثر نگاروں اور شاعروں کے طبقات سنین وار۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات، صنائع و بدائع۔ روزمرہ۔ محاورے۔ تلمیحات۔ تشبیہ استعارہ اور کنایہ وغیرہ۔

ان چیزوں سے یہ کمرہ اچھا خاصا عجائب خانہ بن گیا تھا۔ دوسرے اسکولوں کے لڑکے اور اساتذہ اس کو دیکھنے آتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر اور منیجر مسٹر جارڈن۔ مشن کے کارپردازوں کو خاص طور سے میرا کمرہ دکھاتے تھے۔ ایک ہندو انسپکٹر نے میرا کمرہ دیکھ کر مجھے بڑی داد دی اور کہا اگر دوسرے اسکولوں میں بھی ایسی چیزیں پائی جائیں تو بہت اچھا ہو۔

اسکولوں کی ملازمت میں میرے لئے سب سے زیادہ پریشان مسئلہ کھانے پینے کا تھا۔ ہمارے مسلمان بھائی تو ہندو ہوں یا عیسائی سب کے یہاں کا کھا پی لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں مجھ اکیلے کے لئے علیحدہ بندوبست ہونا کتنا دشوار تھا مگر اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے ہر جگہ بچایا۔ میں نے اس معاملے میں رُو رعایت سے کام نہ لیا اور کھلے لفظوں میں یہ ظاہر کردیا کہ میں کسی کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتا۔

پارکر اسکول میں بھی آئے دن پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لئے مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت دنوں تو حیلے حوالوں سے کام لیتا رہا لیکن

تا بچے وہاں تو آئے دن یہی جھگڑا تھا آخر ایک دن کہنا ہی پڑا کہ جیسے برہمن کسی کا نہیں
کھانے یا ہندو مسلمانوں کے چھوئے ہوئے کھانے پانی سے بچتے ہیں۔ اسی طرح سے ۱
مسلمانوں میں شیعہ فرقہ سوائے مسلمان کے اور کسی کے یہاں کا نہیں کھاتا۔

گو رازِ دل کے کہنے میں سو دقتیں ہیں ہو — لیکن اسے بتا تو دیا جان تو گیا

ہندوؤں اور عیسائیوں کو یہ بات ناگوار تو ہوئی ہوگی مگر ہمیشہ کو روگ
گیا اس کے بعد جب کبھی پارٹی ہوتی تو میرے حصے کی مٹھائی کے پیسے کسی لڑکے کو دے
جاتے وہ مسلمان کے یہاں کی مٹھائی لا دیتا اور میں سب کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھا لیتا

تقسیمِ ملکی کے بعد میری مشکلات

میں نے جس عزت سے پارکر اسکول میں وقت گزارا کم لوگوں کو یہ عزت نصیب ہوئی ہوگی میں اس اسکول میں ۱۹۳۰ء سے لے کر مارچ ۱۹۵۰ء تک رہا۔ اگر ملکی انقلاب نہ ہوتا تو اپنی ملازمت کا وقت پورا کر کے الگ ہوتا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی ملتے ہی ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم کشی کے جو انسانیت سوز کارنامے دکھائے ان کے ذکر سے کلیجہ لرزتا ہے آزادی کا ملنا تھا کہ ہندوؤں کے دماغ خراب ہو گئے اور وہ حکومت کے نشے میں مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

ملکی آزادی کے بعد سب سے پہلی پارٹی جو اسکول میں ہوئی اس میں

شہر کے تمام ہندو لیڈر بلائے گئے اس پارٹی میں ہندو ماسٹروں نے جو اس پارٹی کے منتظم تھے خلاف معمول میرے لئے مسلمان کی مٹھائی نہ منگوائی۔ جب میں نے کھانے سے گریز کی تو انہوں نے بار بار کہنا شروع کیا مولوی صاحب اب یہ مٹھائی کھانی پڑیگی دو قوموں کا نظریہ پاکستان گیا۔ میں نے کہا میرے نہ کھانے کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں یہ میرا مذہبی معاملہ ہے۔

اس زمانے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر تو ار ڈسن نئے آئے ہوئے تھے وہ میرے حالات سے زیادہ واقف نہ تھے وہ سمجھے آپس میں کوئی جھگڑا ہے میرے پاس آکر نہ کھانے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ میں نے کہا آپ اس وقت نہ پوچھیں میں بھر بتاؤں گا۔ دوسرے روز ان کے دریافت کرنے پر میں نے کل حال بتایا انہوں نے مجھ سے کہا اب آپ کا یہ پرہیز نہیں چلے گا۔ ہندو آپ کے دشمن ہو جائیں گے میں نے کہا میں سمجھتا ہوں۔ اسی روز سے یہ رائے قائم کرلی کہ ہمیں پاکستان جانا پڑیگا لیکن اس وقت جانا آسان نہ تھا۔ برابر گشت وخون کی خبریں آرہی تھیں اور سفر کرنا جان پر کھیلنا تھا۔

بمبئی کا عشرۂ محرم

۱۹۴۸ء جب میں انقلاب کی وجہ سے پٹیالہ نہ جاسکا تو سیٹھ حسین بھائی لالجی نے جو کئی سال سے عشرہ میں بمبئی مجالس پڑھنے کے لئے بلا رہے تھے یہ معلوم

کرکے کرچٹیارے سے مسلمانوں کا بالکلیہ اخراج ہوگیا مجھے خط لکھا کہ اب آپ بمبئی آجائیے چنانچہ میں نسیم سلمہ کو ساتھ لے گیا۔ حاجی جمال دہلوی جی کے مسافر خانے میں قیام ہوا بغل میں سیجد ہال میں مجالس ہوئی تھیں سیٹھ کانجی نے حق میزبانی ادا کیا۔ دس بارہ روز بہت خوبی سے گزرے سیٹھ نے بمبئی کے تمام مشہور مقامات دکھائے

مجھے ساحلی شہروں کے موسم کا کوئی تجربہ نہ تھا چونکہ سردی کا موسم تھا میں اپنے ساتھ پورا سرمائی سامان لے گیا تھا وہاں تو دنیا ہی اور تھی لوگ ململ کا کرتا یا بنیان پہنے پھرتے تھے بلکہ دسمبر کے مہینے میں برف کے گلاس پیتے تھے جو لوگ مجھ سے ملنے آتے ان کی تواضع چائے سے ضرور کی جاتی سیٹھ کا ملازم دن بھر یہی کام کرتا۔ میں صرف صبح وشام چائے پینے کا عادی تھا وہاں تو صبح سے شام تک چائے کا دور چلتا تھا اگر میں پینے سے انکار کرتا تو لوگ ڈراتے کہ یہاں کی آب وہوا مرطوب ہے اگر چائے نہ پی تو بیمار ہو جانے کا امکان ہے۔

جب مرادآباد واپس آیا تو چائے رنگ لائی دوسرے روز وقت صبح خون کی کلیاں آئیں۔ اور اتنا خون نکلا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹر ڈسٹرکٹ کا جو مرادآباد کا مشہور ڈاکٹر تھا علاج ہوا۔ خون تو بند ہو گیا نقاہت حد سے زیادہ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتہ بولنے کو منع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو تین ماہ رہا۔

جنوری کے آخر میں سرکار حجۃ الاسلام مولانا محمد سعید صاحب قبلہ رامپور تشریف لائے ہوئے تھے جب انہیں میری علالت کی خبر ہوئی تو مع مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی و مولانا حافظ کفایت حسین صاحب قبلہ اور خان بہادر سید اعجاز حسین صاحب قبلہ تشریف لائے اور چند گھنٹے قیام کیا۔ سعید الملت نے فرمایا

کہ مارچ میں شہید ثالث علیہ الرحمہ کے مزار پر مجالس ہونے والی ہیں۔ آپ آگرہ آئیں وہاں آپ کے لئے دعا کریں گے۔

میں نے کہا کمزوری کا یہ عالم ہے کہ چلا پھرا نہیں جاتا دو باتیں کرتا ہوں تو زبان خشک ہو جاتی ہے۔ فرمایا۔ جو حال بھی ہو آپ چلے آئیے۔ میں نے وعدہ کر لیا مارچ میں اپنے داماد عرفان حسن کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچا۔ سیٹھ کاظمی کو بھی میری علالت کی خبر تھی ان کی بھی یہی رائے تھی کہ میں آگرہ جاؤں۔ جب میں وہاں پہنچا تو حسین بھائی کاظمی آچکے تھے۔ انہوں نے اپنے ہی کمرہ میں مجھے ٹھہرایا۔ صبح کو مجالس کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا سعید الملۃ نے فرمایا سب سے پہلے آپ تھوڑی دیر پڑھیں۔ پھر ہم سب آپ کے لئے دعا کریں گے میں نے چند منٹ ہی پڑھا تھا کہ بدن میں سنسنی پھیلی۔ زبان بند ہوگئی اور قریب تھا کہ میں منبر سے گر پڑوں لوگ یہ حال دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مجھے پکڑے ہوئے کمرے تک پہنچایا۔ بعد ختم مجلس تمام علما پرسش حال کے لئے گئے اور طے پایا کہ شام کو شہید علیہ الرحمہ کی قبر کے گرد بیٹھ کر دعا کریں چنانچہ شام کو سب جمع ہوئے اور دعا کی۔

دوسرے روز صبح کو حسین بھائی نے مجھ سے کہا کہ آپکے چہرہ پر آج رونق ہے میں نے کہا کہ خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ اسی روز شام کو مجھے وہاں سے روانہ ہونا تھا حسین بھائی نے مجھے پہنچانے اسٹیشن تک آئے۔ اور جب گاڑی چھوٹنے لگی تو کہنے لگے آپ کا مرض رخصت ہوا۔ اب آپ مرادآباد بالکل صحیح وسالم پہنچیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا شہید علیہ الرحمہ کی توجہ سے جو شکایات تھیں وہ سب دور ہوگئیں۔

دوسرے سال میں پھر بمبئی گیا اس مرتبہ باندرہ میں مجھے مجالس پڑھنا تھیں۔ باندرہ ہی میں میرا قیام رہا۔ سیٹھ غلام حسین چنائی میرے میزبان تھے۔ حسین بھائی بھی گاہ گاہ میری ملاقات کو آتے تھے۔

رسالۂ نور کا اجراء اور شمیم بک ڈپو کا آغاز

مولوی عبدالشکور اپنے رسالہ النجم میں شیعوں کے خلاف ہمیشہ زہر افشانی کرتا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا محبوب مشغلہ اور کسب دولت کا سوچا سمجھا ذریعہ تھا۔ ایک بار اس نے متعہ پر ایک نہایت تلخ مضمون لکھا۔ سید اکبر حسین جو اکرونڈیہ ضلع مرادآباد کے رہنے والے اور کلکٹری میں ملازم تھے۔ النجم کا وہ پرچہ لے کر آئے اور مضمون سنا کر مجھ سے کہا کہ اس کا دندان شکن جواب ہونا چاہیے اور آپ کی زیر ادارت ایک ایسے رسالہ کا اجراء ہونا چاہیے جس میں ہر ماہ النجم کے مضامین کا جواب شایع ہوا کرے۔

اس زمانے میں کسی ماہوار رسالہ کا اجراء زیادہ دشوار نہ تھا۔ نیوز پرنٹ کاغذ ۳ روپیہ رم تھا۔ جواب سولہ روپیہ۔ کتابت فی صفحہ ۲ چھپائی فی پتھر ۴ تھی۔ یہ اب سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۰ء سے نور کا اجراء ہوا اور سالانہ چندہ دو روپیہ سالانہ ہوا ضخامت ۲۰×۳۰/۸ کے ۴۸ صفحے تھی۔ اس زمانہ کو اس زمانے سے کیا نسبت۔ دس سال نور مرادآباد سے نکلتا رہا۔ اور عبد

کے جوابات کا دندان شکن جواب دیا جاتا رہا۔ ایک فرضی مکالمہ علامہ برزخی اور ان کی بیگم کے مکالمہ کے عنوان سے سالہا سال نکلتا رہا۔ مولوی عبدالطا خوت کی ایک صاحبزادی تھیں درپیچ واقعات کے تحت اپنے پڑوسی منشی غلام حسین سے منسوب کر بیٹھیں ان سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کی شادی علامہ برزخی سے ہوئی جو سنی تھے وہ شیعہ ادھر میں لٹکے ہوئے۔ بیگم چاہتی تھیں شیعہ بنائے علامہ چاہتے تھے سنی بنائیں۔ یہ تھا بیک گراؤنڈ اس مکالمے کا۔ اس مکالمے میں دونوں فریق کے سوال وجواب ایسے دلچسپ انداز میں لکھے جاتے تھے کہ پڑھنے والوں کو ایک روحانی کیف حاصل ہوتا تھا خصوصاً خواتین کو یہ مکالمہ پڑھنے میں بڑا لطف آتا تھا

نور کے مضامین کا زیادہ حصہ میرا ہی لکھا ہوا ہوتا تھا خواہ نثر ہو یا نظم ان مضامین میں بڑی بڑی دشوار گزار منزلیں طے کی گئیں سخت سے سخت مسائل حل کئے گئے۔ ہر دعوے پر دلائل وبراہین کے دریا بہائے۔ کتابوں پر تنقیدیں اور تبصرے کئے۔ ۴۰ سال تک نور جاری رہا اس مدت میں میں نے کبھی اہل قلم کی خوشامد نہیں کی اور گداگری کا دامن کسی کے سامنے نہ پھیلایا۔ اپنا کندھا دینا بار کہہ کر پوری قوت سے بھاری بوجھ اٹھائے چلا گیا۔ ہاں جو اہل قلم از راہ لطف وکرم اپنے مضامین بھیج دیتے تھے ان کو نور میں ضرور جگہ دی جاتی تھی اب کہ پیری نے آدبایا ہے اور دل ودماغ اپنی قوت کھو بیٹھے ہیں۔ جب نور کے پچھلے فائل نظر سے گزرتے ہیں اور اپنے شباب کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو اپنی دماغ سوزی اور جگر کاوی پر تعجب سا ہوتا ہے اب اس باغ میں پژمردہ نہیں سوکھے ہوئے پھولوں کے سوا اور کیا ہے۔

میں بعض عنوانات مسلسل کئی کئی سال تک مضامین لکھتا رہا۔ جیسے حقیقت انسانیہ اسلام فطری دین ہے۔ علامہ برزخی کا مکالمہ۔ مادیت اور روحانیت نغمۂ ناطقہ انسانی۔ روحوں کی حاضرات۔ فلسفۂ غم و شادی۔

صرف نور ہی نہیں جتنے مذہبی اخبار و رسائل تھے ان کے اڈیٹروں کی خواہش پر برابر مضامین لکھتا رہتا تھا۔ بالخصوص مخصوص نمبروں کے لئے۔ طبیعت میں بے پناہ جولانی تھی اس لئے قلم رکتا ہی نہ تھا اور دل اکتاتا ہی نہ تھا۔ زندگی بھر محبوب مشغلہ یہی رہا جس کا آغاز عنفوان شباب سے ہوا تھا اور خاتمہ اس وقت ہوگا جب موت ہاتھ کی گرفت سے قلم چھین لے گی۔

یہ میرے ہی نورِ قلم کا نتیجہ تھا کہ نور چند ہی سال میں تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ اور مومنین کے ہر طبقے میں سراہا جانے لگا۔ علامہ برزخی کا مکالمہ اگرچہ فرضی تھا مگر حقیقت کی جھلک دکھاتا تھا باتوں باتوں میں مشکل مسائل کو حل کرتا تھا شگفتہ بیانی کی وہ دلکش رنگینیاں پکڑی جاتی تھیں کہ بے ساختہ پڑھنے والوں کے منھ سے واہ واہ نکلتی تھی۔

نور نواب صاحب رامپور کی خدمت میں بھی بھیجا جاتا تھا۔ ہر ہائی نس کو علامہ برزخی کا مکالمہ بے حد پسند آیا۔ مولانا سید محمد صاحب دہلوی اس وقت رامپور میں تھے انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا سرکار آپ سے ملنا چاہتے ہیں لہذا پہلی ٹرین سے رامپور پہنچے چنانچہ میں گیا۔ اس وقت نواب رضا علی خان صاحب برسر اقتدار تھے اور قلعہ میں سکونت تھی۔ میں مولانا کے ساتھ نواب صاحب سے ملا۔ پہلا سوال ان کا یہی تھا کہ علامہ برزخی کا مکالمہ کون لکھتا ہے۔ ہر ہائی نس کو بہت پسند ہے

وہ ہر ماہ اس مکالمہ کو بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہیں اسی طرح تعلقہ داران اودھ کی بیگمات اور حیدرآباد دکن امراء کی بیگمات بڑے شوق سے یہ مکالمہ پڑھتی ہیں اور مجھے ہمت افزا خطوط لکھتی تھیں پاکستان آنے کے بعد کچھ دنوں تو یہ سلسلہ چلا لیکن جب حکومت کی طرف سے لے دے ہونے لگی تو بند کردیا اس کے شائقین آج تک پڑھتے ہیں۔

شمیم بک ڈپو

۱۹۳۰ء سے پہلے میرے قلم سے جو کتابیں نکلی تھیں ان کو اور لوگوں نے چھاپا۔ سید متین حسن صاحب مخدوں امروہوی جب رسالہ نور کی کتابت کے سلسلے میں میرے مکان پر قیام پذیر ہوئے تو انہوں نے ایک بک ڈپو قائم کرنے کی طرف مجھے توجہ دلائی چنانچہ میں نے شمیم ڈپو کا افتتاح کردیا۔ تصنیف کرنیوالا مجھ جیسا جفاکش اور لکھنے والا متین حسن جیسا زود نویس محنتی نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں بکڈپو کتابوں سے بھر گیا۔

سب سے پہلے دینی کہانیوں کے چھ حصے چھپے۔ پھر خواتین اسلام۔ سرفروشان ملت۔ مذہبی مکالمہ۔ تحفۃ المومنین۔ استخارہ سجادیہ۔ مصباح المجالس حصہ اول تحفۃ الابرار، وغیرہ اس کے ساتھ درسیات کی کتابیں بھی لکھ ڈالیں جن میں ایک ہزار صفحے کی تہذیب اللغات بھی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان آیا تو نور اور بک ڈپو جان کی طرح اپنے ساتھ لایا۔ نور بھی ۱۹۶۰ء میں تارکی چھاپا گیا بکڈپو بحمد اللہ قائم ہے

تبرائجی مشن میں میری خدمات

تبرائجی ٹیشن بھی یادگار زمانہ تھا ۔ ملک بھر میں شیعوں میں ہل چل تھی ۔ جیل میں جانے کے شوق میں ہر طرف سے جوق در جوق لوگ لکھنؤ چلے جا رہے تھے ۔ شیعوں کا یہ جوش دیکھ کر کانگریس کی دھوتی ڈھیلی ہو گئی تھی ۔ میں نے سرکار نجم العلماء کو لکھا کہ میں بھی جیل میں جانے کے ارادے سے آ رہا ہوں ۔ انہوں نے تحریر فرمایا تمہارے جیل میں جانے سے اس وقت کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا ۔ ایجی ٹیشن کمزور پڑتا جا رہا ہے ۔ بہتر ہوگا کہ تم میرٹھ اور مظفر نگر کا دورہ کر کے مومنین کو بھیجو اور روپیہ بھی ۔ کچھ لوگ معافی مانگ کر جیلوں سے نکل رہے ہیں ان کی روک تھام کرو ۔

میں نے ایک ہفتہ کے اندر سرفروشانِ ملت ایک کتاب لکھی جس میں مختلف زمانوں میں شیعوں کی قربانیوں کا ذکر کیا ۔ اس کی کتابت اور طباعت اور اشاعت کا بندوبست کر کے میں میرٹھ و مظفر نگر کے دورہ پر روانہ ہو گیا اور اشارہ ودز نواب سرفراز علی خاں کے ساتھ بارہہ کی تمام بستیوں میں گیا ۔ وہاں سے روپیہ بھی بھجوایا اور آدمی بھی ۔ واپسی پر سرفروشانِ ملت کی جیلوں میں بھیجنے کی پوری کوشش کی بحمد اللہ اس کا بڑا اچھا اثر ہوا اور معافی مانگ کر نکلنے والوں کا سلسلہ بند ہو گیا ۔

مراد آباد کی اس کمیٹی کا میں صدر تھا جو ہر روز مجاہدین کو مختلف مقامات

سے واپیا مراد آباد لکھنؤ جاتے تھے۔ کھانا پانی سگریٹ اور پان مہیا کرتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ایجی ٹیشن میں کامیابی ہوئی اور مدح صحابہ کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا وہ ختم ہوا۔

ادیبِ اعظم کا خطاب

سرکار علامہ مولانا سید محمد سبطین صاحب قبلہ مرحوم سرسوی بڑی غیر معمولی قابلیت کے عالم تھے۔ علم کلام اور مناظرہ میں ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ کئی قابلِ قدر کتابیں ان کی یادگار ہیں جیسے الصراط السوی۔ کشف الاسرار۔ اسلامی نماز۔ خلافتِ الٰہیہ وغیرہ ایک ماہانہ رسالہ البرہان بھی ان کی سرپرستی میں کئی سال نکلتا رہا جس میں ان کے بلند پایہ مضامین ہوتے تھے۔

مولانا مرحوم پہلے پٹیالہ کالج میں پروفیسر رہے۔ پھر ان کا تقرر لدھیانہ گورنمنٹ کالج میں ہوگیا۔ تازیست وہیں رہے۔ مولانا مرحوم کو مجھ سے بڑا انس تھا اور میری مذہبی خدمات کی ان کے دل میں بڑی قدر تھی بالخصوص ان مضامین کی جن کو میں نور میں لکھتا رہا تھا۔

ایک بار انھوں نے مجھے توجہ دلائی کہ البرھان میں کسی ایسے دلچسپ مضمون کا سلسلہ شروع کیا جائے جس سے البرھان کی اشاعت بڑھ جائے۔ اس وقت تک رسالہ نور کا اجرا نہ ہوا تھا۔ مجھے فی الجملہ فرصت تھی۔ میں نے اس حکم کی تعمیل میں "آل برزخ کانفرنس" کے عنوان سے البرہان میں لکھنا شروع کیا جو کئی

قسطوں میں شایع ہوا چونکہ مضمون نہایت دلچسپ تھا۔ البرہان کی اشاعت بڑھ گئی۔ اس کے بعد ایک اور سلسلہ "اسلام فطری دین ہے" کا شروع کیا۔ یہ بھی کئی قسطوں میں شایع ہوا۔

مولانا کو خطاب دینے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ بڑا برجستہ خطاب دیتے تھے کسی کو دوشیزۃ العلما کسی کو کنجڑا العلما کسی کو مادر زاد مجتہد اور کسی کو امی علامہ کہا کرتے تھے ان الفاظ میں بڑی معنویت مخفی ہوتی تھی۔ مجھ سے فرمایا کرتے آپ تو مشیں العلما ہیں۔ جب میرے مضامین کا سلسلہ البرہان میں شایع ہوا تو ایک خط میں مجھے تحریر فرمایا میں آپ کے زور قلم اور اسلوب تحریر کی داد دیتا ہوں آج سے میں آپ کو ادیب اعظم لکھا کروں گا چنانچہ اس کے بعد جو مضمون البرہان میں چھپا وہ میرے نام سے پہلے "ادیب اعظم" لکھوا دیتے۔ میں نے اس کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔

شمیم سلمہ کی پاکستان کو روانگی
تھلیسہ دلکبہ کے بڑگرے میسے

۱۹۴۹ء میں شمیم میاں ایم اے ایل ایل بی علی گڑھ سے پاس کرنے کے بعد مراد آباد آگئے وکالت کا ٹریننگ کرنے کے بعد مراد آباد میں وکالت کرنا چاہی مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اردو کی بجائے دفاتر کی زبان ہندی ہو رہی ہے ان کا دل اس طرف سے ہٹ گیا اور پاکستان جانے کی ٹھان لی۔ ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان جانے کے

نے جوڑ توڑ لگانے لگے چونکہ یہ زمانہ بہت خطرناک تھا مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں ہر طرف سے آرہی تھیں اس نے شمیم کا یہ ارادہ میرے لئے سخت تکلیف دہ تھا میں نے ہرچند سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ پاکستانی فوج کا ایک دستہ آج گیارہ بجے دن کے یہاں سے گزر رہا ہے ان میں میرا ایک دوست بھی ہے اس نے لکھا ہے کہ اگر پاکستان جانا چاہو تو گیارہ بجے ریلوے اسٹیشن پر آجاؤ۔ میں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ میں نے کہا اتنے جلد تو سامان فراہم کرنا ممکن نہیں اب دس بجے ہیں اور تم گیارہ بجے جانا چاہتے ہو اتنے جلد روانگی کا بندوبست کیسے ہو میرے پاس روپیہ بھی نہیں بینک سے روپیہ لانے میں وقت لگے گا۔ انہوں نے کہا آپ مجھے صرف سو روپے دیدیجئے۔ مجبور ہو کر میں نے ایک صاحب سے تنخواہ قرض لے کر دیدیے مگر ان کی جدائی کے تصور سے کلیجہ کانپ گیا۔ ایک سال ان کی شادی کو ہوا تھا بی بی کو ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ بہرحال وہ روانہ ہوگئے جب تک ان کے پہنچنے کا خط نہ آیا ہم سب پریشان رہے۔

خلیفہ خاندان چونکہ لاہور پہنچ چکا تھا لہٰذا شمیم کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ ریل سے اتر کر ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اور بڑے اطمینان سے ملازمت تلاش کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت جلد ان کو حبیب بینک میں ملازمت مل گئی۔ چند ماہ کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ کراچی کو ہوگیا۔ یہاں وہ ایک عزیز کے یہاں کچھ دن رہے پھر انھوں نے پیر الٰہی بخش کالونی میں ایک کوارٹر کرایہ پر لے لیا چند ماہ بعد انہوں نے اپنے بھائی ندیم اور اپنے پھوپی زاد بھائی فرمان حسن کو بھی بلالیا۔ اس کے بعد میرا اپنی بہن کو بھی بلا بھیجا۔ میں نے اس کو اور اس کے شوہر اور بچوں کو

ہوائی جہاز سے لاہور بھیجا۔ وہاں سے وہ کراچی پہنچ گئے۔ ان سب کی جدائی ہم سب پر بہت شاق تھی اور مرادآباد میں رہنا اب ایک منٹ گوارا نہ تھا مگر ہمارا جانا آسان نہ تھا اول تو ملازمت کا سلسلہ پھر پرمٹ سسٹم اس پرمٹ کو پاکستان سے حاصل کرنا تھا۔

نسیم سلمہٗ کی شادی مرشدآباد میں

نسیم سلمہٗ جب انجینیرنگ کلاس میں تعلیم پا رہے تھے ان کا رشتہ مرشدآباد میں ماسٹر سید علی رضا صاحب کی بڑی لڑکی سے طے پاگیا تھا۔ [illegible] میں جب وہ انجینیر ہوگئے تو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ شمیم میاں کو اس کی شادی میں شرکت کے لئے آنا تھا مگر ان کے جانے کے کچھ بعد ہی ان کی بی بی جو میری بھانجی تھی انتقال ہوگیا اس نے ایک لڑکی چھوڑی تھی اس لئے ان کا آنا ضروری تھا چنانچہ وہ آگئے اور شادی کی تیاری شروع ہوئی۔ سرکار سعید الملۃ مولانا محمد سعید صاحب سے میں نے درخواست کی تھی کہ میرے ساتھ مرشدآباد تشریف لے جاکر عقد پڑھیں۔ انہوں نے منظور فرمالیا تھا دور دراز کا سفر اور گرمی کا موسم سب چھوٹے بڑے چودہ آدمی یہاں سے روانہ ہوئے جب لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے تو جناب سعید الملت اور مولانا محمد علی میر صاحب قبلہ موجود تھے۔ سرکار سعید الملت نے بعض موانع کی بنا پر اپنے نہ جانے کی معذرت کی مگر پلیٹ فارم ہی پر ہم سب کو چائے اور بہت

سی چیزیں کھلائیں پلائیں جو ان کی محبت کی دلیل تھی۔ بحمد اللہ یہ شادی بخیر وخوبی انجام پذیر ہوئی۔

رام پور میں عشرہ محرم

سنہ ۵۰ کا عشرہ محرم میں نے نواب صاحب رام پور کے جدید عزا خانے میں پڑھا جو خاص باغ میں بنایا گیا تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں صاحب رام پور چھوڑ کر خاص باغ کے محلات میں آگئے تھے۔ یہیں زنانے اور مردانے دو عالی شان عزا خانے بنوائے تھے اب رام پور وہ رام پور ہی نہ تھا۔ ہندوؤں کی دوادوش کا میدان تھا جس قلعے کے محلوں میں پرندہ پَر نہ مارتا تھا وہاں ہندو نیتا کھلے بندوں قہقہے لگاتے پھرتے تھے۔ حامد منزل میں پرائمری اسکول تھا۔ قلعہ کی مسجد اور امام باڑہ کے صحن میں مٹھائی کے دونے سگریٹ کے خالی پیکٹ وغیرہ پڑے تھے۔ اس انقلاب پر رونا آتا تھا قلعے کے امام باڑہ میں اب منبر کے سوا کچھ نہ تھا سب سامان خاص باغ کے عزاخانہ میں چلا گیا تھا جہاں روزانہ تین مجلسیں پڑھتا تھا صبح کو قلعہ میں شام کو مقبرہ میں اور رات کو خاص باغ میں چونکہ دو صاحب اور بھی پڑھنے والے تھے لہٰذا تیسرے روز ہر مجلس پڑھنا پڑتی تھی۔ عشرہ بھر نواب صاحب نہ لذیذ کھانا کھاتے تھے۔ اور نہ چارپائی پر سوتے تھے۔

پاکستان آنے کی تیاری

تقسیم ملک کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے وہ سخت پریشان کن تھے۔ جا بجا فسادات، لوٹ مار اور خوں ریزی ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ بڑا پر آشوب تھا مسلمانوں کی جان مال اور آبرو کوئی چیز محفوظ نہ تھی زمانہ کا کیا انقلاب تھا کہ جس فضا میں پلے بڑھے تھے اب وہاں کی سرزمین کاٹنے کھاتی تھی۔ دل چاہتا تھا پرندے کے پر مل جائیں تو اڑ جائیں اسکول سے علیحدہ ہو جانا تو آسان تھا لیکن دقت یہ تھی کہ پراویڈنٹ کا روپیہ ڈاک خانہ میں جمع تھا اس کا لینا ضروری تھا کیونکہ وہ تقریباً چھ ہزار روپیہ تھا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ محکمہ تعلیم کے افسران کو اگر یہ پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں شخص پاکستان جانا چاہتا ہے تو اس کا فنڈ روک لیتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ ایسی تدبیر اسکول سے علیحدگی ہو جائے اور کسی پر ظاہر نہ ہو مگر کوئی تدبیر راس نہ آئی اسکول سے علیحدگی تو ہو گئی مگر فنڈ کا روپیہ نہ ملا۔

اب سب سے اہم معاملہ پاکستان سے پرمٹ آنے کا تھا۔ ہندوستان کے پولیس والے پاکستان سے آنے والے ہر خط کو سنسر کرتے تھے اور اگر لفافہ میں پرمٹ ہوتا تھا تو اسے روک لیتے۔ اور طرح طرح سے ڈراتے دھمکاتے تھے راشن کارڈ ضبط ہو جائے گا گھر کا سامان قرق کر لیا جائے گا اس طریقہ کار سے وہ بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے تھے۔ چنانچہ جب ہمارا پرمٹ آیا تو پولیس نے پریشان

سزا شروع ہو گیا اور پچاس روپیہ لے کر پرمٹ دیا۔ اتفاق سے ماہ مارچ میں ہولی کے موقع پر کئی اضلاع میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ مراد آباد بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ ہر طرف ہندوؤں کے حملے ہو رہے تھے۔ یہ حال دیکھ کر مسلمانوں نے پاکستان چلنا شروع کر دیا۔ مراد آباد کے کلکٹر نے روک تھام کے لئے اعلان کر دیا کہ جو مسلمان گھر کا سامان فروخت کرتا نظر آئے اس کا راشن کارڈ ضبط کر لو۔ اور گھر کا سامان قرق کر لو۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے جانا کیسا دشوار بن گیا۔ جو سامان خفیہ فروخت ہو سکا کر دیا کچھ لوگوں کو رات کے وقت دیا باقی کو وہیں چھوڑا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ گھر سے نکل اسٹیشن پہنچے۔ دو صاحب ہمیں پہنچانے آئے۔ ایک منشی حمید حسن صاحب دوسرے سید عسکری حسن صاحب ریٹائرڈ ریلوے گارڈ۔

ہم سب دس آدمی تھے اور چودہ بنڈل سامان کے بڑی مشکل سے بکنگ کلرک کے حقوق ادا کر کے سامان بک کرایا۔ اور اپنے ساتھ صرف ایک پاندان اور ٹفن کیریر رکھا۔ یہ سفر سکنڈ کلاس میں تھا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو وہ دو نو بھاگے ہوئے آئے اور خبر دی کہ اس گاڑی میں آپ کا سامان نہیں رکھا جا سکا۔ ہم دوسری گاڑی سے بھیجیں گے آپ امرتسر میں انتظار کریں۔ یہ سن کر ہوش اڑ گئے۔ امرتسر ایسی جگہ نہ تھی کہ وہاں اسٹیشن پر رہ کر انتظار کیا جاتا۔

ہمارے درجے کے پاس دوسرے درجے میں ایک اور خاندان پاکستان جا رہا تھا انہوں نے ہماری داستان غم سن کر کہا آپ امرتسر نہ اتریں بلکہ جالندھر اتر جائیں وہاں سے پانچ میل دور پاکستانی کیمپ ہے۔ تانگہ کر کے وہاں پہنچ جائیں اور وہاں سے امرتسر جا کر مال کا پتہ کریں اگر آ گیا ہو تو جالندھر کے لئے بک کرا لیں

جالندھر سے ہر روز لاہور کو بس جاتی ہے اس میں بیٹھ کر لاہور پہنچ جائیں۔ چنانچہ بے شمار دقتوں اور پریشانیوں کے بعد پانچ روز پاکستانی کیمپ میں قیام کے بعد ہم پاکستانی حدود میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک نقطۂ مہاجر کچھ معنی رکھتا تھا اور اس کے اوپر ہمدردانہ نظر پڑتی تھی چونکہ سفر کی تکان بہت زیادہ غالب تھی۔ لہٰذا لاہور میں قیام نہ کر سکے چاہا کہ جس طرح ہو جلد اس مصیبت کو ختم کر دیا جائے۔

مراد آباد سے آٹھ سو روپے لے کر چلے تھے۔ ہندو راج کمباروں کے حق حقوق ادا کرتے کرتے دو دانہ نکل گیا جب کراچی پہنچے تو کچھ پاس نہ تھا۔ نسیم۔ پروین۔ عرفان۔ اور فرحان اور صلاح الدین حسن جب پلیٹ فارم پر نظر آئے تو مردہ بدنوں میں نئے سر سے جان آگئی اور ایک ہفتہ کی تکالیف کو بھول گئے۔ پیر الٰہی بخش کالونی میں قیام کیا اس مکان میں دو کمرے تھے اور تھوڑا سا صحن۔ مختصر سا غسلخانہ۔ باورچی خانہ اور پاخانہ۔

میرے کتب خانہ کی تباہی و بربادی

جب میرا ارادہ پاکستان آنے کا ہوا تو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح مجھ سے پہلے میری کتابیں پاکستان پہنچ جائیں لیکن فضا مکدر ہونے کی وجہ سے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی پتہ چلا کہ دہلی میں انڈو پاکستان ٹریڈنگ کمپنی بنی ہے جو ہندوستان سے پاکستان کو مال بھیجتی ہے۔ میں نے اس سے خط و کتابت

کی اس کا ایک ایجنٹ مراد آباد آیا اور پورا یقین دلایا کہ ایک ماہ کے اندر کتابیں کراچی پہنچ جائیں گی۔ ۵ صد روپیہ فی من کرایہ طے ہوا۔ میں نے دو بوروں میں تفسیر و حدیث و علم کلام وغیرہ کی بہترین کتابیں بھر کر جن کا وزن چار من سے زیادہ تھا۔ مع دو سو بیس روپے کے اس کے حوالے کر دے۔ اور دس روپے اسٹیشن تک پہنچانے کے۔ اس زمانہ میں رسید کا کیا سوال تھا چپ چاپ سب کچھ دیدیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ وہ دھوکہ ہی دھوکہ تھا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ کاروبار کیا گیا تھا روپیہ سے زیادہ کتابوں کے جانے کا صدمہ ہوا۔

کچھ دنوں بعد ایک اور کمپنی سے اسی محصول پر بات چیت ہوئی دس من کتابیں پانچ بوروں میں بھر کر اس کے حوالے کیں اس نے کراچی پہنچا دیں لیکن جب یہاں آکر بورے کھول کھول کر دیکھے تو بہت سی پرانی کتابیں تو چور چور ہو کر بھس بن گئی تھیں بعض آدھی غائب بعض کی جلدیں شکستہ۔ بسوائے صبر چارۂ کار کیا تھا۔

جو کتابیں مراد آباد میں چھوٹی تھیں وہ لوگ ٹوڈ بیت لے گیا ہو گا۔ تقریباً دو سو کتابیں جن میں میری مصنفہ کتابوں کی ایک ایک کاپی تھی وہ میرے بھائی کی غفلت سے ضائع ہو گئیں۔

یادِ وطن

مئی سنہ ۵۲ء میں ہم بجائے امروہہ کے کراچی کے باشندے ہو گئے کبھی حج کے سلسلے میں کراچی کا نام سن لیا کرتے تھے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہو کہ ہم کراچی کے مستقل باشندے بن جائینگے اور کچھ دنوں مہاجر کے لقب سے یاد کئے جائیں گے۔ آہ وہ محبوب سرزمین جس کی محبت ہماری رگ رگ میں پیوست تھی جہاں ہمارے بزرگوں نے ۸ صدیاں گزاری تھیں۔ جہاں ہمارے خاندان کے گھر ملاتے ہوئے بس رہے تھے۔ آہ وہ سرزمین ہم سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی۔ اور ایک تسبیح کے دانے بکھر کر خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے اب جو لوگ وہاں رہ گئے وہ دوسرے ملک کے باشندے ہو گئے اب ان سے ملنا آسان نہ رہا۔

سن ۵۲ء میں آنے کے بعد

کراچی میں آنے کے بعد

تسیم میاں کے پاس جو کوارٹر تھا ہم وہیں ٹھہرے۔ یہ کوارٹر سب ایک ہی طرح کے تھے کسی مکان کا ملنا دشوار تھا جب تک مکان کا نمبر اور بلاک معلوم نہ ہو کیونکہ اس بستی میں جو مہاجر آباد ہوئے تھے وہ مختلف صوبوں اور مختلف شہروں کے تھے اور آپس میں روابط قائم نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو جانتا ہی نہ تھا۔

میں کوئی غیر مشہور آدمی نہ تھا۔ میرے کراچی آنے کی خبر سنتے ہی لوگ آنے شروع ہو گئے۔ میرے ہم وطنوں میں سب سے پہلے سید معز حسین صاحب ایڈوکیٹ مجھ سے ملے۔ یہ اس وقت پیر کالونی کے قریب مارٹن کوارٹرس میں رہتے تھے۔ یہ بھی مہاجرین کی نئی آبادی تھی۔ مگر اس میں سرکاری ملازم رہتے تھے۔ مہاجرین نے اس کالونی میں بہت سی زمین پر احاطہ کھنچوا کر اس میں امام باڑہ اور مسجد بنالی تھی۔ معز صاحب اس وقت اس انجمن کے صدر تھے۔ ان کی خواہش کے مطابق عید کی نماز میں نے اس مسجد میں پڑھائی۔ دوسرے میرے ہم وطن سید منظاہر حسن صاحب ساکن محلہ ستدو بھی پیر کالونی ہی میں رہتے تھے وہ بھی بڑی محبت سے برابر ملتے رہے۔

حکیم ننھے صاحب مرحوم جو صوبہ بہار کے رہنے والے تھے رسالۂ نوید کے خریدار تھے۔ مجھے ان سے غائبانہ نیاز حاصل تھا۔ مجھ سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ اور پیر کالونی میں رہتے تھے۔ حکیم صاحب نابینا ہو چکے تھے مگر قوت ایمانی نے دل کی آنکھیں روشن کر دی تھیں۔

ورود کراچی سے تیسرے روز حکیم صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ اور شام کو مجھے چائے پر بلایا۔ باتوں باتوں میں رات ہو گئی۔ جب میں چلنے لگا تو حکیم صاحب نے اپنے ایک عزیز کو ساتھ بھیجنا چاہا۔ میں نے کہا میرا مکان تو قریب ہی ہے کسی کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ یہ کالونی بھول بھلیاں ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں اپنے گھر والی گلی بھول گیا۔ چونکہ سب کوارٹر ایک ہی شان کے تھے اور درمیانی کچے راستے بھی ملتے جلتے تھے۔ پھر رات کا وقت

ہر طرف مارا مارا پھر رہا تھا مگر اپنا گھر ہاتھ نہ آتا تھا اب کس سے پوچھوں کہ میرا گھر کہاں ہے مزہ کی بات ہے کہ اپنے گھر کے سامنے سے کتنی بار گزرا مگر پہچان نہ سکا۔ آخر ایک بار گزرا تو میرا ایک لڑکا محمد حامد ۔ ۔ میں کھڑا ہوا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا تب سمجھ میں آیا کہ یہ میرا گھر ہے۔

لطیفہ۔ اس کالونی میں اس وقت پانی کے نل نہ تھے۔ بہشتی مشک کے حساب سے پانی لاتے تھے ایک بار انہوں نے کسی جھگڑے میں بائیکاٹ کر دیا تو پانی بند ہو گیا گھر والے ایک ایک قطرہ کو ترس رہے تھے۔ لکھنؤ کے ایک بزرگ ملنے کو آئے اور فرمانے لگے مولانا پیشاب کی تیز حاجت ہے لوٹے میں پانی منگوا دیجئے۔ میں نے نوکر سے کہا سوڈا واٹر کی دو بوتلیں لے آؤ۔ انہوں نے کہا حضور میں نے پانی مانگا ہے۔ استنجے کے لئے۔ میں نے کہا یہ پاکستان ہے اور اس بستی کا نام ہے پیر کالونی جو پیر کی کرامت ہے کہ یہاں پیشاب پاخانہ کی طہارت سوڈے واٹر سے ہوتی ہے۔ وہ بزرگ بہت سیدھے سادے تھے کہنے لگے قبلہ آب مضاف سے تو طہارت جائز نہیں۔ میں نے کہا مجبوری میں سب جائز ہے۔ اس کے بعد تھوڑا سا پانی ایک پڑوسی کے یہاں سے منگوا کر ان کی ضرورت پوری کی۔

نماز جماعت کا انتظام

اس کالونی میں مختلف اضلاع کے مومنین رہتے تھے وہ بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گئے اور انہوں نے ایک انجمن بنا لی اور مجالس کا سلسلہ شروع ہو گیا

پھر یہ خواہش ہوئی کہ نماز بجماعت ہو۔ وہاں شیعوں کی کوئی مسجد نہ تھی میرے مکان سے کچھ دور جیل خانے کی دیوار کے قریب ایک قطعہ اراضی خالی پڑا تھا۔ وہاں تھوڑی سی جگہ صاف کرکے سیمنٹ کے بلاکوں سے گھیر لی اور نماز بجماعت ہونے لگی۔ حاجی سیٹھ غلام حسین چھیپا بھائی مرحوم مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے مسجد تعمیر کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن الاٹ منٹ کی کوششوں میں ہم لوگ ناکام رہے اور اس منصوبہ کو ترک کرنا پڑا۔

نور کا اجرا

کراچی میں آنے کے تین ماہ بعد میں نے نور جاری کیا اور شمیم بکڈپو سے کتابوں کے چھپنے کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نور کی اشاعت میں یہاں کافی اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان میں صرف ایک ہزار چھپتا تھا۔ یہاں رفتہ رفتہ دو ہزار تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ ترقی اس وقت تک رہی جب تک جامعہ امامیہ کا کام میں نے اپنے ذمے نہیں لیا تھا۔ ایک دل دو طرف ہو جانے سے وہ ترقی رک گئی۔ دوسرے کاغذ کتابت اور طباعت کی اجرتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس کی وجہ سے خرچ آمدنی سے زیادہ ہونے لگا۔ تاہم یہ رسالہ [illegible] تک جاری رہا اس کے بعد کچھ حکومت کی طرف سے پابندیوں نے کچھ پیرانہ سالی نے اس کو بند کرنے پر مجبور کیا۔

کالونی کے مکان میں صرف دو کمرے تھے یہاں تین سال بہت تکلیف

سے گزرے اس مدت میں ندیم سلمہ کی کوشش سے ناظم آباد نمبر ۲ میں ۱۲۰ گز زمین کا ایک پلاٹ شمیم سلمہ کے نام پر الاٹ ہوگیا۔ میرے داماد سید عرفان حسن نے بھی اسی سے متصل زمین الاٹ کرائی چنانچہ دونوں مکان برابر ایک ہی نقشے کے مطابق تعمیر ہوئے اور ہم ۱۹۵۸ء میں کالونی سے یہاں منتقل ہوگئے۔

کراچی سے پشاور تک سفر

کراچی پہنچ کر تین چار ماہ بعد میں نے ایک سفر کراچی سے پشاور تک کیا۔ اس کے دو مقصد تھے اول احباب پٹیالہ بالخصوص خلیفہ خاندان کے افراد سے جو مختلف شہروں میں آباد ہوگئے ملاقات کرنا۔ ان میں سے زیادہ حضرات لاہور میں تھے۔ چونکہ شفیق محترم جناب مولانا خلیفہ محمد ہاشم صاحب میرے کراچی آنے سے ایک سال قبل انتقال فرما چکے تھے۔ لہٰذا ان کی تعزیت سب سے مقدم تھی۔ خلیفہ ہادی حسن مرحوم اور خلیفہ محمد ہاشم صاحب مرحوم کے خاندان والے اس وقت ایبٹ روڈ کی ایک عالی شان کوٹھی میں آباد تھے اس کے بعد یہ کوٹھی بلا شرکت غیرے خلیفہ سید سعادت حسین صاحب کے نام الاٹ ہوگئی۔ باقی حضرات کو دوسری جگہ کوٹھیاں ملیں۔ میں جب اس کوٹھی میں پہنچا تو خلیفہ محمد ہاشم کو یاد کر کے دیر تک متاثر رہا۔ ایک مجلس بھی ایصال ثواب کے لئے منعقد ہوئی جس میں میں نے پڑھا۔

پٹیالہ میں اس خاندان کی جو وجاہت تھی وہ میری نظر کے سامنے تھی۔

جن لوگوں کے یہاں میں نے ۷۰ سال عشرہ محرم پڑھا تین سال بعد وہ پھر میری نظر کے سامنے تھے افسوس اس کا تھا کہ خلیفہ محمد ہاشم جیسی قابل ہستی اب میرے سامنے نہ تھی اب اس خاندان کے وہ نونہال میرے سامنے تھے جن کا بچپن میں نے دیکھا تھا اور اب وہ ماشاء اللہ جوان اور صاحب اولاد تھے۔

یہ سب میرے عزیز مجھے اپنے خاندان کا بزرگ سمجھتے تھے اور ہر حالت میں میرا احترام مدنظر رکھتے تھے۔ خلیفہ ہادی حسن کی بیٹی ثریا سلمہا کو جسے بچپن سے میں نے بیٹی بنایا تھا دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جب میں ملا تو اسی طرح گلے مل کر روئی جیسے بیٹی اپنے باپ سے کسی مصیبت کے بعد مل کر روتی ہو۔ پٹیالہ سے لاہور تک آنے میں جن مصائب و آلام کا سامنا ہوا تھا جب اس کی زبان سے سنا تو دل بھر آیا دیر تک روتا رہا۔

لاہور کے بعد میں سرگودھا گیا وہاں اس خاندان کی ایک معزز فرد خلیفہ محمد اسلم صاحب سے ملا۔ ہم دونوں گلے مل کر دیر تک روتے رہے۔ خلیفہ صاحب بڑی محبت سے پیش آئے۔ چار پانچ روز ان کے پاس رہا وہاں سے دیگر مقامات پر گیا۔

دوسرا مقصد اس سفر سے یہ معلوم کرنا تھا کہ پاکستان میں شیعوں کے دینی مدرسے کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ چونکہ ہمارے دینی مدارس کی بڑی تعداد ہندوستان میں تھی بالخصوص مدرسۃ الواعظین لکھنؤ جو ہمارے مذہب کی تبلیغ کا ایک بڑا مرکز تھا وہ بھی ہم سے چھوٹ گیا تھا لہٰذا کسی ایسی درس گاہ کی بھی یہاں تلاش تھی جب مجھے اس جستجو میں ناکامی ہوئی تو میں نے ہر مقام کے

کے سربرآوردہ حضرات کے سامنے اس ضرورت کا اظہار کیا تائید تو سب نے کی مگر کوئی اس کا بیڑا اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آخر مایوسی کے ساتھ کراچی واپس آ گیا۔

اکاڑہ کا محرم

نیپال کے سید ہادی حسن صاحب ایڈوکیٹ کا خاندان ہجرت کے بعد اکاڑہ ضلع منٹگمری وساہی وال میں مقیم تھا۔ ہادی حسن صاحب اکاڑہ کے سٹیشن کاش میں میں ایک اعلےٰ عہدہ پر سرفراز تھے۔ اکاڑہ کے مومنین پر ان کا بڑا اثر تھا۔ مقامی حضرات کی مدد سے ایک مسجد اور امام بارہ بھی بنوالیا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے عشرہ محرم میں انہوں نے مجالس پڑھنے کے لئے مجھے بلایا۔ بحمداللہ مجالس کامیاب رہیں۔ سید ہادی حسن صاحب نے جس فراخدلی اور انتہائی خلوص سے میزبانی کے فرائض انجام دئے میں مدت العمر ان کو نہیں بھول سکتا ان کے والد ماجد سید مقبول حسین صاحب مرحوم جو بڑے نیک سیرت اور ایمان سے بھرپور انسان تھے۔ بکمال شفقت ومحبت پیش آئے ختم عشرہ کے بعد جب میں کراچی آنے لگا تو ہادی حسن صاحب نے بہت سے گرانقدر تحفے بھی دئے اب وہ سالہا سال سے لاہور میں مقیم ہیں۔ ہر سال لاہور میں ملاقات ہوتی ہے بڑے خلوص سے ملتے ہیں۔

سیالکوٹ کا محرم

۱۹۵۲ء میں مومنین سیالکوٹ نے مجھے مدعو کیا۔ میرا قیام اس حصۂ زمین کے ایک کمرہ میں ہوا جہاں ایک شاندار عزا خانہ بنا ہوا ہے۔ بحمد اللہ بڑی شاندار مجالس ہوئیں۔ طویل و عریض میدان میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی ان مجالس میں بکثرت اہل سنت حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔ میری تقاریر کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ کئی شخصوں کو شیعی عقاید سے انس ہوگیا۔ وہ روزمرہ میرے پاس آکر معلومات حاصل کرتے تھے ان میں سے دو آدمی ہم سے اتنے قریب ہوگئے تھے کہ اپنے مذہب سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے تھے۔ بعد کو پتہ چلا کہ وہ شیعہ ہوگئے۔

کوئٹہ کا محرم

۱۹۵۳ء میں میں نے پنجابی امام باڑہ میں عشرہ پڑھا لیکن کوئٹہ پہنچ کر پہلی ہی رات کو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ عزا خانے کے پہلو میں ایک چھوٹا سا مکان تھا اس میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ پہلی ہی رات کو ایسی چوری ہوئی کہ تن پر کپڑوں کے سوا اور کوئی چیز باقی نہ رہی جسم پر جو کپڑے تھے وہ بھی سفری گرد آلود مجھے دوسرے دن ہی مجلس پڑھنا تھی لیکن ایسی صورت میں منبر پر جانا کیسے ہو۔ سردی کا موسم اور یہاں یہ حال انجمن والوں نے فوراً کپڑا منگا کر لباس تیار

کرانے کا اہتمام کیا تاہم تیاری میں چند روز لگ گئے۔ ان ایام میں ایک اوقی چادر لپیٹ کر مجلس پڑھی گئی۔

اہل انجمن اور چھاؤنی کے چند افسروں نے بریگیڈیر الطاف۔ کرنل آفاق حسین میجر آل حسنین صاحب بہتیری کوشش کی مال برآمد ہو جائے اور چور پکڑا جائے مگر کامیابی نہ ہوئی دو انجمنوں کی عداوت میں میں غریب مارا گیا۔ مجھے کسی چیز کے اتنا غم نہ تھا جتنا ان تین ٹرنک بکسوں کا جن کے اندر میری چالیس سال کی کتب بینی کا خلاصہ تھا یہ خزانہ مجھے پھر نصیب نہ ہوا۔

جہاں تک میری مجالس کی کامیابی کا تعلق ہے بحمداللہ ان میں گذشتہ کی نسبت تمام مجالس سے زیادہ مجمع ہوتا تھا۔ امام بارگاہ کے ہال اور صحن کے علاوہ سامنے کی سڑک اور اس کے آگے کا میدان کھچا کھچ لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ جنرل موسیٰ بھی ایک دو مجلس میں تشریف لائے۔ ایک مجلس میں نے ہزارہ کے امام بارگاہ میں پڑھی جنرل صاحب بھی اس مجلس میں موجود تھے۔

چوری ہو جانے کے بعد مجھے میرے مکرم چوہدری فرمان علی صاحب اپنے مکان میں لے آئے اور عشرہ بھر میرا قیام وہیں رہا۔ چوہدری صاحب نے جس خلوص اور فراخدلی سے میری مہمان نوازی کی اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ چوہدری صاحب کو میں پہلے سے جانتا تھا وہ سالہا سال سے نور کے خریدار تھے۔ بڑے پرجوش اور مخلص قومی کارکن ہیں اس انجمن کے سالہا سال سے صدر رہتے آ رہے ہیں۔ زائرین مشہد مقدس کو ان کی وجہ سے بڑی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں میرے زمانۂ قیام میں جابجا دعوتیں ہوئیں۔ کرنیل آفاق حسین صاحب بریگیڈیر

الطاف صاحب ۔ میجر آل حسنین صاحب ۔ سردار بخش خاں صاحب و سردار عیسیٰ خاں صاحب برادران جنرل محمد موسیٰ صاحب اور سید افتخار حسین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ سب حضرات بڑی محبت سے ملتے رہے اور جب میں کوئٹہ سے چلا تو بہت سے مومنین اسٹیشن تک آئے ۔

لاہور کا محرّم

۱۹۵۲ء سے مجھے یہاں ان مجالس کے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا جنہیں میں نے پیار میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۳ء تک پڑھا تھا ۔ خلیفہ خاندان کے افراد کو جب تک باقاعدہ جاگیر کا الاٹمنٹ نہ ہوا وہ مالی کشمکش میں مبتلا رہے ۔ جب اس طرف سے اطمینان ہوا اور جائداد سے آمدنی ہونے لگی تو عشرہ محرم کی مجالس شروع کی گئیں ۔ خلیفہ سید سعادت حسین صاحب بی اے جو بلحاظ زہد وتقویٰ عبادت وریاضت تواضع وفروتنی اور اخلاق وعادات اور خلیفہ محمد ہاشم صاحب مرحوم کے صحیح معنی میں جانشین ہیں اور بشری لباس میں ایک ملک صفات انسان ہیں ان مجالس کے لاہور میں بانی ہوئے ۔ اخراجات میں خلیفہ محمد کاظم صاحب ایم ایس سی برادر خلیفہ سعادت حسین صاحب اور خلیفہ سعید حسن مرحوم اور خلیفہ اقبال حسین صاحب شریک رہے لیکن شریک غالب خلیفہ سعادت حسین صاحب ہی رہے ۔ مجالس کا پورا اہتمام ان ہی سے متعلق ہے مہمانوں کا تمام خرچ وہی برداشت کرتے ہیں ۔ محرم میں بہت سے لوگ ان کے مہمان ہوتے ہیں ۔

ان کو درحقیقت ائمہ طاہرین بالخصوص امام حسین علیہ السلام سے عشق ہے۔
وہ امام علیہ السلام کے نام پر اپنی ہر شے قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر کس و ناکس
سے بخلق و مدارا پیش آتے ہیں انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ ان مجالس
کا آغاز کیا۔

پہلی محرم سے ۲ بجے دن سے زنانی مجلس ہوتی ہے۔ بے شمار خواتین شریک
ہوتی ہیں، لاہور کا کوئی حصہ اور کوئی طبقہ ایسا نہیں رہتا جہاں کی مستورات
اس مجلس میں نہ آتی ہوں عالیشان کوٹھی کا ہر حصہ اور صحن بھرا رہتا ہے۔ بعد
مجلس سب کو نیاز تقسیم ہوتی ہے۔ ان مجالس کا بالکلیہ اہتمام بیگم صاحب خلیفہ سعادت
حسین صاحب کرتی ہیں عشرہ محرم کے بعد چہلم کے عشرے میں پھر اسی شان سے
مجالس ہوتی ہیں آخر روز تابوت برآمد ہوتا ہے اور کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔

محرم میں چار بجے شام سے کوٹھی کے صحن میں شامیانوں کے نیچے مردانی
مجلس شروع ہوتی ہے۔ تمام گھر پورے انہماک سے اہتمام مجلس میں مصروف رہتا
ہے اور مجالس کی کامیابی میں ہر امکانی کوشش کرتے ہیں۔

مجالس کے آغاز سے پہلے یہ اندیشہ تھا کہ لاہور جیسے شہر میں ایک نئی مجلس
جڑ نہ پکڑے گی کیونکہ قدیمی مجالس میں نامور اور کہنہ مشق واعظین بیان فرماتے تھے
لیکن خلیفہ سعادت حسین اور ان کی بیگم کی خوش نیتی سے مجالس ایسی کامیاب ہوئیں
کہ اول نمبر پر آگئیں۔ ہر سال مجالس میں مجمع بڑھتا ہی گیا اور اب تو یہ عالم ہے
کہ کوٹھی کے طویل و عریض صحن میں جب کہیں جگہ نہیں رہتی تو لوگ سڑک پر کھڑے
ہو کر سنتے ہیں۔

مستورات اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ کوٹھی کے تمام کمرے گیلری برآمدہ اور صحن سب پُر ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۳ء کے ۵ سال چھوڑ کر ۳۴ سال سے اس منبر پر پڑھ رہا ہوں۔ ہندوستان یا پاکستان کا کوئی ایک واعظ بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو اتنی طویل مدت تک ایک منبر پر پڑھا ہو۔ میرے اور مرحوم خلیفہ محمد ہاشم صاحب کے درمیان عاشور کے دن ٹھیالہ کے عزا خانہ کلب حسین میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ نہ میں ٹھیالہ کے سوا مدت العمر کہیں جاؤں گا نہ وہ کسی اور کو بلائیں گے۔ میں نے اس عہد کو آج تک نبایا ہے اور جب تک دل میں قوت اور زبان میں بولنے کی طاقت ہے اس وعدہ کو پورا کرتا رہوں گا تاکہ خلیفہ صاحب کی پاک روح سے مجھے شرمندگی نہ ہونا پڑے۔

اس مجلس میں ۴ بجے سے ۵ بجے تک سوز خوانی ہوتی ہے ٹھیک ۵ بجے میں منبر پر بیٹھتا ہوں گھنٹہ ڈیڑھ پڑھتا ہوں۔ چوتھی تاریخ سے بعد مجلس ماتم ہوتا ہے ساتویں تاریخ علم نکلتا ہے جو وہیں رہتا ہے آٹھویں کو ذوالجناح برآمد ہوتا ہے۔ یہ بھی احاطہ کے اندر ہی رہتا ہے۔ دسویں محرم کو ۳ بجے شام کو مجلس ہوتی ہے۔ تسبیح کی زیارت ہوتی ہے فاقہ شکنی ہوتی ہے۔ رات کو مجلس شام غریباں ہوتی ہے۔

عشرہ اربعین میں زنانی مجلس ہوتی ہے جس میں بہ کثرت مستورات شریک ہوتی ہیں۔ ۲۰ صفر کو تابوت نکلتا ہے جس پر عورتیں نوحہ خوانی کرتی ہیں۔

۱۹ صفر کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

عزا خانے کے لئے خلیفہ صاحب نے ایک نہایت خوب صورت ضریح بنوائی

جو روضہ امام حسین علیہ السلام کا ہو بہو نقل ہے۔ غرض عزاداری کے سلسلہ میں خلیفہ صاحب نے کوئی چیز چھوڑی نہیں۔

خلیفہ سعادت حسین صاحب عرصے سے لائلپور کاٹن ملز میں ملازم ہیں۔ وہاں رہ کر انھوں نے قوم کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے چیلنز کالونی میں بہت بڑا رقبہ گورنمنٹ سے لے کر پوستان زہرا کے نام سے اپنی سرپرستی میں ایک نہایت شاندار عزاخانہ بنوایا ہے جس میں ہر سال تین دن مجالس ہوتی ہیں جن کو نامور واعظین بیان فرماتے ہیں اگرچہ یہ سب کچھ قومی چندہ سے ہوا ہے۔ مگر اس میں سب سے زیادہ دخل خلیفہ صاحب کی کوششوں کو ہے۔

خلیفہ صاحب کے تین صاحبزادے ہیں اور تین صاحبزادیاں ماشاءاللہ سب مذہبی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ محرم و چہلم کی مجالس میں ان سب کا انہماک دیکھنے کے قابل ہوتا ہے میری دعا ہے کہ جلد اس کوٹھی کے صحن میں ایک شاندار عزاخانہ بن جائے اور اس میں یہ مجالس ہوا کریں۔

جامعہ امامیہ کراچی

سنہ ۱۹۵۳ء میں مولانا محمد بشیر صاحب قبلہ کراچی تشریف لائے وہ آل پاکستان شیعہ کانفرنس کی صوبائی شاخ یہاں قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن سید مسیب علی صاحب میرے یہاں تشریف لائے اور مذکورہ بالا خواہش ظاہر

کر کے فرمایا آپ اس کی صدارت قبول کر لیں۔ میں نے کہا میں اس کا اہل نہیں ہیں۔ میں تو نہایت خاموشی سے گھر میں بیٹھ کر قلم چلایا کرتا ہوں میں اپنے کو ان بکھیڑوں سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ مولانا بڑا اصرار کرتے رہے اور میں انکار کرتا رہا۔ وہ نبض شناس زمانہ ہیں باتوں باتوں میں تاڑ گئے۔ کہ میرا رجحان طبع کس طرف ہے۔ فرمانے لگے میری غرض یہ ہو کہ کراچی میں ایک مدرسۃ الواعظین کھولا جائے کیونکہ لکھنؤ کا مدرسۃ الواعظین اب ہماری ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا یہ تو مسلم ہے مگر میرے موجودہ مشاغل (لنوراو تصنیفات) اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں کسی ادارہ کا سربراہ ہو کر کوئی خدمت انجام دوں۔ آخر بہت سی گفتگو کے بعد طے پایا کہ قرآن سے تفاؤل کیا جائے۔ یہ آیت برآمد ہوئی یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک الخ۔ اب میرے لئے انکار کا محل ہی نہ رہا۔ مولانا یہ بھاری بوجھ میری گردن پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔

میرا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جب کسی ذمہ داری کو اپنے اوپر لیتا ہوں تو پھر حتی الامکان اس میں کامیابی کی کوشش کرتا ہوں۔ جناب نواب مظفر علی خانصاحب قزلباش صدر پاکستان شیعہ کانفرنس اس وقت وزیر مالیات تھے۔ جب میں لاہور میں عشرہ پڑھنے گیا تو میں اور مولانا بشیر احمد صاحب ان سے ملے۔ اور پراونشیل شیعہ کانفرنس کے تحت مدرسۃ الواعظین بنانے کا خیال ظاہر کیا اور یہ درخواست کی کہ وہ کراچی میں مدرسہ کے لئے زمین الاٹ کرا دیں۔ انہوں نے وعدہ فرما لیا اور ناظم آباد نمبر ۳ میں ۲۱۳۲ مربع گز زمین الاٹ کرادی چونکہ ابھی تک پراونشیل شیعہ کانفرنس کوئی رجسٹرڈ ادارہ نہ تھا اس لئے یہ زمین بحیثیت صدر آل پاکستان شیعہ کانفرنس

نواب صاحب کے نام الاٹ ہوئی ۔ یہ نواب صاحب ہی کی ذات تھی کہ یہ زمین ہمیں
ناظم آباد جیسی آبادی میں مل گئی ۔ اس کے معاوضہ میں قسط قسط ہمیں دس
ہزار روپیہ دینا تھا پہلی قسط تقریباً چار ہزار تھی جس کو ادا کرنے کے بعد ہم کو قبضہ
ملنا تھا۔ میں نے اعیان شہر کی ایک کمیٹی بنائی اور ان کی مدد سے سو سو روپے کے
ممبر بنانے شروع کئے۔ چونکہ اس وقت دینی اداروں کی طرف مہاجرین اور مقامی
مومنین سب کو توجہ تھی لہذا بہت جلد چار ہزار روپیہ جمع کر کے زمین پر قبضہ
لے لیا اس کے بعد تعمیر کا نمبر آیا مجھے اور میرے شرکا کار کو اس میں بڑی پوری
جدوجہد کرنا پڑی ۔ جو دقتیں مجھے پیش آئیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ پہلے ۹۶۲
لمبا احاطہ تعمیر ہوا۔ پھر معاون حسن مرحوم نے ایک دروازہ بنایا اس کے بعد مسجد
بنی ۔ جانب غرب دکانیں تعمیر ہوئیں۔ اس کے بعد ارباب ثروت کو ایک ایک کمرہ
بنوانے کی طرف توجہ دلائی ۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد نواب مظفر علی خاں صاحب
قزلباش کے مبارک ہاتھوں سے رکھوایا گیا۔ نواب صاحب نے خود بھی مدد
کی اور دوسروں سے مدد کرائی ۔ اس سلسلہ میں چندہ لینے کے لئے مجھے کئی سفر
کرنا پڑے ۔ سب سے بڑی مدد اس سلسلے میں حبیب ایجوکیشن ٹرسٹ سے ملی ہے میں
نے اپنی زندگی کو اس کام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ چھ سال یہ تعمیری سلسلہ جاری
رہا جامعہ امامیہ کمیٹی کے تمام ممبران نے مجھ سے پورا پورا تعاون کیا ۔ ورنہ اتنی
بڑی عمارت بن نہ سکتی تھی میرے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مجھ جیسے
کمزور آدمی سے اتنا بڑا کام ہو جائے گا۔ جامعہ امامیہ حسب ذیل عمارت ہے۔
ایک مسجد اس کے عقب میں نو دکانیں ۔ ایک مؤذن کا مکان ۔ مدرسے

کے آٹھ کمرے نیچے ہیں دو گیلریاں یا اندر آنے کا راستہ ہے دو زینے ہیں پاخانے اور غسل خانے ہیں۔ ایک ہال ہے اس کے آگے وسیع برآمدہ ہے۔ یہی صورت اوپر کی منزل میں ہے۔ جانب شرق سات دکانیں اور تین فلیٹ ہیں۔ جانب شمال تین دکانیں ہیں تینوں طرف عالی شان دروازے ہیں۔ باب معاذ ین۔ باب یونس۔ باغیچہ میرے بڑے لڑکے شمیم الحسن نے بنوایا۔

اس سر زمین پر جو عمارت بھی کسی نے بنوائی ہے اس کے نام کا پتھر نصب کرا دیا گیا ہے بلکہ جس نے جو چیز دی ہے الماری۔ میز کرسی پنکھا وغیرہ اس پر اس کا نام ضرور لکھ دیا گیا ہے۔ نیچے کے ہال میں لائبریری ہے۔ فی الحال دس الماریوں میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کتاب ہے۔ جس نے جو کتاب دی ہے اس پر اس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔

۱۹۵۶ء سے تعلیم کا آغاز ہوا پہلے صرف واعظین کلاس تھا۔ جب ہر سال اس کے لئے طلبا ء نہ مل سکے تو نیچے کے درجات کھولنے لازم ہوگئے۔ فی الحال حسب درجات ہیں۔

مولوی الف۔ مولوی ب۔ عالم۔ فاضل۔ واعظین۔ پانچ مدرس ہیں۔ چھوٹے مدرس چھوٹے بچوں کو قرآن اور دینیات پڑھاتے ہیں۔ دار الاقامہ میں اس وقت تیس لڑکے ہیں جن کو علاوہ کھانے اور چائے پانچ روپے ماہوار جیب خرچ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں اور کاپیاں بھی مدرسہ کی طرف سے ملتی ہیں۔ غریب لڑکوں کو لباس اور بستر بھی دیا جاتا ہے۔ مدرسین کے علاوہ ایک صاحب لڑکوں کو خوشنویسی بھی سکھاتے ہیں۔ مدرسہ کا باقاعدہ آفس ہے۔

جامعہ امامیہ سے جو طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں ان کو ممتاز الواعظین کی سند دی جاتی ہے۔ اس وقت تک آٹھ طالب علم سند حاصل کر چکے ہیں جن میں سے دو عراق میں سند اجتہاد حاصل کرنے گئے ہیں باقی مختلف مقامات تبلیغ کر رہے ہیں۔

مدرسہ کی ایک انتظامیہ کمیٹی ہے جس کے پندرہ ممبر ہیں۔ میں اس کا ۱۹۶۳ء سے صدر ہوں جامعہ امامیہ کراچی میں شیعوں کا مرکز ہے پاکستان میں کسی دینی مدرسہ کی ایسی شاندار عمارت نہیں ہے اللہ تعالے نے مجھے شاید پاکستان اسی لئے بھیجا تھا کہ میں اس اہم خدمت کو یہاں آکر انجام دوں۔

امروہہ کے لئے یہ کچھ کم فخر کا موقعہ نہیں ہے کہ لکھنؤ کے مدرستہ الواعظین کے بانی بھی امروہوی ہی تھے اور کراچی کے مدرستہ الواعظین کا بانی بھی امروہوی ہی ہے۔

باوجود اپنی پیرانہ سالی کے میں کسی وقت جامعہ امامیہ کی خدمت سے غافل نہیں اب تک اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتا رہتا ہوں۔ چونکہ آمدنی سے خرچ زیادہ ہے اس لئے اس کمی کا پورا کرنا میں نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ جس طرح ممکن ہوتا ہے اسے پورا کرتا ہوں چونکہ لوگوں کو میری ذات پر بحمد اللہ اعتماد ہے اور ہر شخص جان گیا ہے کہ میں یہ خدمت بغیر کسی ذاتی غرض کے قربتاً الی اللہ یہ کام کر رہا ہوں۔

کراچی میں میری تمام مجالس کا نذرانہ۔ نکاح خوانی کی رقم بسم اللہ خوانی کی رقم۔ سنگ بنیاد رکھنے کی رقم سب جامعہ امامیہ کے لئے ہے۔ میں نے اعلان کر دیا ہے کہ پہلے جامعہ امامیہ سے رسید کٹواؤ تب مذکورہ بالا

ضرورتوں کے لئے میرے پاس آؤ۔ خدا میری اس خدمت کو قبول کریگا۔

آل پاکستان شیعہ کانفرنس

پاکستان بننے کے بعد سب سے پرانا قومی ادارہ آل پاکستان شیعہ کانفرنس ہے جس کے صدر نواب مظفر علی خاں صاحب قزلباش رہے بہ حیثیت پروشیل شیعہ کانفرنس کے صدر کے میری وابستگی اس کانفرنس سے سنہ ۱۹۵۲ء سے ہے۔ لاہور کے دو اجلاسوں اور سرگودھا کے ایک اجلاس میں مجھے ایک نشست میں اس کی صدارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور صدارتی تقریریں بھی کی ہیں۔

سفر عراق و دمشق و ایران

ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء میں میں اپنی بی بی اور پوتی فرزانہ سلمہا کے ساتھ عازم عراق ہوا۔ یہ سفر دوارکا جہاز میں سکنڈ کلاس میں کیا گیا۔ یہ میرا پہلا سمندری سفر تھا۔ نویں روز یہ جہاز بندرگاہ بصرہ پر جا کر لگا۔ خوجہ مسافر خانے کے مینیجر کو پہلے سے اطلاع دیدی تھی جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی وہ آگئے اور ہم کو ایک کار میں سوار کر کے مسافر خانے لے گئے ایک دن اور ایک رات ہمارا قیام مسافر خانہ

میں رہا اس کے بعد ستاد وغیرہ بدلوا کر ہم بذریعہ ٹرین کربلائے معلےٰ پہنچ گئے۔ جناب مولانا شبیر حسین صاحب قبلہ مجتہد مدرس ہندی کو جو نجف اشرف میں مقیم ہیں میں نے اپنے آنے کی اطلاع دیدی تھی چنانچہ انھوں نے سید ہاشم صاحب خادم کربلائے معلےٰ کو معین کیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر جا کر مجھے اپنے مسافر خانے میں لے آئیں جب ہم کربلا کے اسٹیشن پر پہنچے تو وہ وہاں موجود تھے۔ وہاں سے ہمیں اپنے مسافر خانے میں لے آئے۔ میرے ہم سفر سید قدرت علی صاحب اور حاجی رحمت علی تھے وہ میرے ساتھ اسی مسافر خانے میں مقیم تھے۔ دوسرے روز مولانا شبیر حسین صاحب کربلا آ گئے اور تیرہ روز تک روزانہ نجف سے کربلا آتے رہے ان کی وجہ سے مجھے بہت سی سہولتیں حاصل ہوئیں تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف مولانا کی معیت میں حاصل ہوا۔ یہ بھی امام علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا کہ اس مدت میں میری مریضہ بی بی پر بلڈ پریشر کا کوئی دورہ نہ پڑا۔ معمولی سی تکلیف رہی۔

سید مرتضیٰ علی صاحب انجنیر اور ان کی بیگم صاحبہ نے جو کئی سال سے وہاں مقیم ہیں ہماری خاطر تواضع اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ان ہی کی کار میں میں اپنی مریضہ بی بی کو تمام مقامات مقدسہ پر لے گیا۔ دونوں میاں بی بی بڑے فراخ دل اور مہماں نواز ہیں۔

تیرہ روز کربلائے معلےٰ رہ کر ہم نجف اشرف گئے اور سید احمد خادم کے مکان پر قیام کیا۔ مولانا شبیر حسین صاحب قبلہ کی وساطت سے تمام علمائے نجف سے شرف ملاقات حاصل ہوا دو مرتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ آقائے محسن الحکیم مدظلہ العالی

کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا جامعہ امامیہ کے حالات بیان کئے اور راقم نے اس میں سے ہم امام کو جامعہ میں خرچ کرنے کے لئے تحریری اجازت حاصل کی۔

دیگر علمائے نجف کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ بھی ملا۔ جیسے آقائے شیخ بزرگ آقائے خوئی اور آقائے نائنی وغیرہ نجف اشرف کے بہت سے ہندی پنجابی۔ ایرانی اور بلتستانی طلبا سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

جناب مولانا محمد حسین صاحب مجتہد نے جو اب مدرسہ محمدیہ سرگودھا میں پرنسپل ہیں اس زمانہ میں فارغ التحصیل ہو کر پاکستان آنے والے تھے۔ بڑے خلوص کا اظہار فرمایا اور ایک روز ہم سب کی دعوت کی۔ سرکار حجۃ الاسلام مولانا صادق علی صاحب قبلہ لاہوری نے بھی ایک شاندار دعوت کی اور ایک مجلس منعقد کی جس میں میں نے فضائل محمد و آل محمد بیان کئے۔ ایک روز مولانا شبیر حسین صاحب قبلہ نے بھی بڑی پُر تکلف دعوت کی۔ پانچ روز قیام نجف میں بھی مولانا میرے ساتھ رہے اور عزیزوں سے بڑھ کر سلوک کیا۔ ان کی وجہ سے وطن کی سی سہولتیں مجھے حاصل رہیں۔

یہاں سے ہم لوگ کاظمین گئے اور شیخ محمد کاظم خادم کے یہاں قیام کیا۔ گرمی کا موسم تھا اور مکان چاروں طرف سے گھرا ہوا کمروں میں روشندان ندارد مزہ یہ کہ غسل خانہ بھی نہیں۔ تیرہ روز اس مکان میں سخت تکلیف اٹھانا پڑی۔ مگر چونکہ یہیں سے سامرہ۔ دمشق و ایران جانا تھا۔ لہذا یہ تکلیف برداشت کرنا پڑی میری بی بی کو گرمی کی وجہ سے یہاں سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ ہم نجف اشرف سے

نقوی صاحب کی کار میں کاظمین آئے تھے اور ان ہی کی کار میں سامرہ گئے۔

دمشق کے سفر میں پریشانی رہی تاہم بخیر و خوبی وہاں کی زیارات کا شرف حاصل ہو گیا۔ وہاں سے واپسی پر ایران کا قصد کیا۔ یہ سفر قم تک بذریعہ بس کرنا تھا۔ راستہ بہت خراب بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی۔ متواتر جھٹکے لگنے سے میری بی بی پر اختلاج کا دورہ پڑ گیا ہر آن یہ خطرہ تھا کہ کہیں راستے ہی میں خاتمہ نہ ہو جائے۔ خدا خدا کر کے دو دن اور دو راتوں کے بعد یہ سفر ختم ہوا۔ لیکن قم پہنچ کر ان کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی مجبوراً ایک رات قیام کر کے وہاں سے بذریعہ ریل مشہد مقدس پہنچے۔ مُلّا قمّی کے مسافرخانے میں قیام تھا۔ یہاں آکر طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی خیال تھا کہ یہاں عرصے تک رہنا ہو گا۔ میں روضہ مبارک پر چلا گیا اور دونوں نے ضریح مبارک سے لپٹ کر فریاد کی رو رو کر دعا مانگی۔ مولا نے مدد کی اسی روز حالت ایسی ہو گئی کہ وہ باطمینان زاہدان آگئیں اور پھر وہاں سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے کراچی پہنچ گئے۔

میری دوسری بی بی کا انتقال

۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء کو میری بی بی کے بائیں طرف کل جسم پر فالج گرا جس سے نصف بدن بے کار ہو گیا۔ ہر قسم کا علاج کیا گیا مگر فائدہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اور روز بروز حالت خراب ہوتی گئی۔ لیکن دماغی حالت زیادہ خراب نہ



سید تہذیب الحسن نقوی



سید عرفان حسن زیدی
ایم اے بی ٹی



سید شبیہ الحسن نقوی
ایم اے ایل ایل بی



ڈاکٹر سید توصیف الحسن نقوی
ایم ایس سی ۔ پی ایچ ڈی

تھی بولتی چالتی رہیں۔ دسمبر ۶۳ء میں فالج کا دوسرا حملہ داہنی جانب ہوا جس نے سارا بدن بے حس کر دیا ان کی بیماری کا سلسلہ دو سال آٹھ ماہ رہا۔ ایک اپاہج انسان کی خدمت کس قدر دشوار ہوتی ہے کہ لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ مگر یہ ان کی انتہائی ہردل عزیزی تھی کہ گھر کی ایک فرد بھی ان کی خدمت سے نہ اکتائی اور ہر طرح ان کو راحت پہنچانے کی کوشش کی مگر موت کا جو وقت ہے وہ ٹلنے والا کہاں۔ آخر ۵ مارچ ۱۹۶۶ء کو راہی جنت ہوئیں۔

ان کے مرنے کا جو صدمہ ان کے متعلقین کو ہوا وہ ناقابل بیان ہے شاید ہی کوئی ساس اپنی بہوؤں کو اتنی عزیز ہوگی جتنی وہ مرحومہ تھیں ان کے مرنے سے میرے گھر میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ بھرنے والا نہیں۔ ان کی موت کا سب سے گہرا اثر میرے دل و دماغ پر ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی روز سے قلم کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی اور طبیعت کی شگفتگی بری طرح مسل گئی اگرچہ زندہ ہوں اور کام بھی کرتا ہوں لیکن زندگی کا لطف کھو بیٹھا ہوں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے ؎ اب وہ رعنائی خیال کہاں

اس تڑپ میں چند شعر جو آہوں سے لکھے گئے وہ یہ ہیں۔

سوختہ جگر کی آہ

نوحہ ہجوم کا ہر شب جان حزیں پہ آج ۔ ویراں سا ایک گھر دل اندوہگیں ہے آج
وحشت سرا بنی ہوئی یہ سرزمیں ہے آج ۔ لطف بہار جس سے تھا وہ گل نہیں ہے آج

پہلی سی اب پھڑک نہیں نبضِ حیات میں
خاک اُڑ رہی ہے میرے لئے کائنات میں

بارِ غم و الم سے دبا جا رہا ہوں میں — خونِ جگر کو آنکھوں سے برسا رہا ہوں میں
اک ہوک دل میں اٹھتی ہے گھبرا رہا ہوں میں — بے کیف زندگی کی ہوا کھا رہا ہوں میں

سینے میں آگ بھڑکی ہے دل داغدار ہے
کس طرح چین آئے کہ رگ رگ میں خار ہے

سمجھا رہا ہوں اپنے دلِ بے قرار کو — اجڑے چمن میں لاؤں کہاں سے بہار کو
تسکین جس سے ہوتی تھی اس جانِ زار کو — آنکھوں سے دیکھتا ہوں اب اس کے مزار کو

اے میری زندگی کے سہارے کدھر گئی
میں جس کے دم سے جیتا تھا ہائے وہ مر گئی

بدتر ہے قید خانے سے یہ گھر ترے بغیر — وحشت کا گھر ہے زیست کا منظر ترے بغیر
کوہِ الم گرا مرے دل پر ترے بغیر — ہے زندگی یہ موت سے بدتر ترے بغیر

راہی عدم کو ہو گئیں منہ مجھ سے موڑ کر
جا سوئیں اپنی قبر میں دل میرا توڑ کر

اے بزمِ زندگی کے اُجالے کہاں ہے تو — اس اجڑے گھر کو کون سنبھالے کہاں ہے تو
رہ رہ کے لب پہ آتے ہیں نالے کہاں ہے تو — مجھ کو بھی اپنے پاس بلا لے کہاں ہے تو

کمرہ اداس خالی تری خوابگاہ ہے
حسرت سے دیکھتا ہوں فقط لب پہ آہ ہے

گھبرا کے تجھ کو شام و سحر ڈھونڈتا ہوں میں — تھی جس میں دلکشی وہ نظر ڈھونڈتا ہوں میں

بے نور گھر ہوا اپنا قبر ڈھونڈتا ہوں میں | جو خاک میں ملا وہ گہر ڈھونڈتا ہوں میں

برسوں کا ساتھ چھوٹ گیا اشکبار ہوں
فرقت میں تیری شام و سحر بے قرار ہوں

پیش نظر ہیں سب ترے آثار زندگی | چالیس سال تو رہی غمخوار زندگی
بدتر ہے موت سے یہ شب تار زندگی | مرنے سے تیرے لٹ گئی سرکار زندگی

زنداں وہ گھر ہے جو کبھی راحت نشان تھا
تیرا وجود میرے لئے اک جہان تھا

جھیلیں مرض کی سختیاں کیا کیا نہ تین سال | حالت کو تیری دیکھ کے بڑھتا رہا ملال
صحت پہ تیری آتا رہا دن بدن زوال | دل کانپ اٹھتا تھا کرکے تری موت کا خیال

کھٹکا تھا جس کا آہ وہ ہنگام آگیا
اکھڑی جو سانس موت کا پیغام آگیا

ویراں چمن ہے رخصت فصل بہار ہے | فرط غم و الم سے کلیجہ فگار ہے
فرقت میں تیری طفل و جواں اشکبار ہیں | ہر لحظہ تیری یاد میں دل بے قرار ہے

بیٹی نڈھال بیٹیوں پہ غم کا وفور ہے
سنگ الم سے شیشۂ دل چور چور ہے

سید سبطین احمد صاحب امروہوی نے حسب ذیل تاریخ کہی۔

شد روانہ سوئے فردوس بریں از ایں جہاں | از دل و جاں بود قربان و نثار فاطمہ
ہاتف غیبی بگفتہ بہر سال رحلتش | یار سا لیسین دولت در جوار فاطمہ

۱۳۸۴ھ

سید محب علی قاسم جائسی صاحب نے تاریخ لکھی :

کجا دار فانی کجا باغ جنت ۔۔۔ کہ آں بقعۂ نور این ست ظلمت
پے سال رحلت ندا کرد ہاتف ۔۔۔ بہ رحمت حق بہ حسین دولت

جامعہ امامیہ پر آئی بلا ٹلی

جامعہ امامیہ کے جانب شمال ایک قطعہ زمین پارک کے لئے خالی پڑا تھا۔ ۲۴ر جولائی ۷۶ء کی شب میں اہل سنت نے ایک چبوترہ بنا کر صبح کی نماز ادا کی۔ اور اس کو مسجد قرار دیا یہ چبوترہ مسجد جامعہ امامیہ کے بالکل مقابل تھا۔ صرف ایک سڑک درمیان میں تھی۔ میرے اور دیگر مومنین کے لئے یہ امر بہت تشویشناک تھا کیونکہ مسجد بننے کی صورت میں فریقین کے تصادم کا ہر وقت خطرہ رہتا۔ تیسرے روز ان لوگوں نے ایک لمبا چوڑا ٹین کا سائبان لوہے کے ستون گاڑ کر مسجد کی شکل دیدی۔

ہمارا ایک وفد کمشنر صاحب سے ملا اور سارا حال بیان کیا۔ کمشنر صاحب نے اس کے منہدم کرنے کا حکم صادر کیا۔ ۳۰ر جولائی کو اعلیٰ حکام پولیس کی ایک بڑی جماعت نے کرائے اور اس تمام کنٹرول کو اکھاڑ پھینکا۔ اور پولیس وہ سب سامان ٹرکوں میں بھر کر لے گئی۔ اس کے بعد بھی ان لوگوں نے وہاں نماز پڑھنی نہ چھوڑی۔ اس کے متعلق ایک وفد کمشنر وغیرہ سے پھر ملا۔ ادھر میں لاہور گیا۔ پیچھے

تو ہوم سکریٹری سے ملا پھر گورنر صاحب (جنرل محمد موسیٰ خاں) سے ملنے مع صادق علی صاحب زرفانی گورنر ہاؤس پہنچا اور ٹائپ شدہ ایک درخواست میں کل حال لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا اور ان کے پی اے سے کہا کہ مجھے ملاقات کا وقت دیں۔ انہوں نے کہا بتاؤں گا۔ دوسرے روز انہوں نے پی اے سے کہا۔ مولوی صاحب سے کہہ دو کہ وہ کراچی چلے جائیں میں نے کمشنر سے فون پر کہہ دیا ہے۔ چنانچہ جب میں کراچی آیا تو معلوم ہوا پھر پولیس آئی اور جو چبوترہ بنایا تھا۔ اسے مسمار کر کے برابر کر دیا۔ اس کے بعد سیمنٹ کے ستون کھڑے کر کے خاردار تار لگا دیا گیا۔ اور ایک بورڈ لگا دیا کہ یہ کراچی میونسپلٹی کا زیر تعمیر باغیچہ ہے۔ پھلواری لگنے سے قبل لوگوں نے عدالت سے اسٹے آرڈر لے کر رکوا دیا۔ راتوں کو وہ خاردار تار بھی کھمبوں میں سے نکال کر اس خالی حوض میں ڈال دیا جو کے ایم سی نے بنوایا تھا۔

کافی کا ترجمہ

حضرات اہلسنت نے اپنی تمام کتب احادیث کا ترجمہ کر ڈالا۔ مگر شیعوں کی کتب اربعہ ایک ہزار سال سے بے ترجمہ پڑی ہوئی ہیں۔ عربی فارسی میں نہ معلوم کتنی شرحیں اور ترجمے ہوئے۔ مگر ہندوستان و پاکستان کے کسی عالم کو اردو میں ترجمہ کرنے کی توفیق نہ ہوئی اور اس ایمان و معرفت کے خزانے سے اردو داں مومنین قطعاً بے خبر ہیں۔ اگرچہ اس کام کے لئے بڑا وقت اور محنت درکار تھی۔ مگر میں نے کمر ہمت باندھی اور ۱۹۶۳ء سے اس دینی خدمت کا کام شروع کر دیا۔

پہلے اصول کافی جلد اول کا ترجمہ قسطاً قسطاً رسالہ "نور" میں شایع کرنا شروع کردیا یہ کام میں نے ایسے سخت وقت میں شروع کیا جب کہ میری بی بی پر فالج گر چکا تھا۔ اور ایک اپاہج انسان کی شب و روز نگرانی کا بار قدرت نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ اور سکون و اطمینان مجھے نصیب نہ تھا۔ بہر حال جب جلد اول کا ترجمہ نور میں ختم ہو گیا تو میں نے تقریباً چھ ہزار روپیہ خرچ کر کے بہترین صورت میں طبع کرایا۔ جلد اول کا ترجمہ ختم ہوتے ہی میں نے نور میں جلد دوم کا ترجمہ شروع کیا اور جب بفضل ایزدی وہ بھی ختم ہو گیا تو بھی اتنا ہی روپیہ خرچ کر کے طبع کرایا۔ یہ دونوں جلدیں ایک ہی صورت و شان کے ساتھ مومنین تک پہونچ گئیں۔ اس کے بعد میں نے فروع جلد اول کا ترجمہ شروع کیا چونکہ پوری جلد اول کا ترجمہ بہت ضخیم ہو جاتا اس لئے میں نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا بحمد اللہ حصہ اول طبع ہو چکا ہے اور حصہ دوم عنقریب طبع ہو نیوالا ہے یہ اللہ کا فضل ہی فضل ہے کہ اس پیرانہ سالی میں اتنا بڑا کام مجھ ناچیز سے ہو گیا۔ شاید یہی میرے لئے ذریعہ نجات ہو جائے اس سے پہلے میں حدیث کی مشہور کتاب جامع الاخبار کا ترجمہ بنام تحفۃ الابرار کر چکا ہوں ان کتابوں کے علاوہ فضائل چہاردہ معصومین کی نہایت جامع اور بہترین کتاب مناقب ابن شہر آشوب علیہ الرحمہ کا ترجمہ بھی دو جلد وں میں مجمع الفضائل کے نام سے کر چکا ہوں سنہ ۱۹۷۴ء تک میری مصنفہ، مولفہ اور مترجمہ کتابوں کی تعداد ۵۰ ہو چکی ہے۔ ابھی ایک کتاب مجمع الآیات جس کی ضخامت تقریباً $\frac{20\times30}{8}$ سائز پر ۱۲ سو صفحات ہو گی۔ طبع ہونے کو باقی ہے اس کتاب میں ہر مضمون کی آیتوں کو یکجا کر کے مع تفسیر و ترجمہ لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالے میری اس

اس خدمت کو جو اس دینِ مبین کی حمایت میں ہو چکی ہے قبول فرمائے اور تصدق معصومین میرے گناہوں کو بخش دے۔

میری اولاد

میری دو شادیاں ہوئیں پہلی بی بی میرے تایازاد بھائی سید مبارک حسن صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جو بحمد اللہ بقید حیات ہیں اور حج و زیارات کی سعادت حاصل کر چکی ہیں ان کے بطن سے تین اولادیں ہوئیں ایک لڑکی اور دو لڑکے۔

(۱) بلقیس خاتون جس کی شادی محلہ ٹکڑہ کے سید آل محمد سے ہوئی اس کے بطن سے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہوئے۔ لڑکی کا نام ادریسہ ہے۔ بڑا حسنین محمد تھا جو عالم شباب میں ایک ناگہانی حادثہ میں فوت ہو گیا۔ دوسرا لڑکا سبطین محمد ہے جو نیشنل بینک میں لاہور کی ایک برانچ کا منیجر ہے اور آٹھ سو روپیہ تنخواہ پاتا ہے۔ سید آل محمد صاحب جب ۱۹۴۷ء میں ضلع حصار سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو بہاول نگر میں مقیم ہوئے اور ۱۹۶۲ء تک وہیں رہے۔ ان کو کلیم کے سلسلے میں تقریباً ایک لاکھ کی جائداد وہاں ملی۔ ۱۹۶۲ء میں وہاں سے منتقل ہو کر لاہور آ گئے۔

(۲) سید تہذیب الحسن سلمہ جو اپنی فطری کمزوری کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے، اردو اور ہندی دونوں میں مڈل کیا اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا۔ مزید ٹیچر ہوئے۔ انگریزی میں ہائی اسکول سے آگے نہ بڑھ سکے۔ امروہہ کے

ایک پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ نہایت سعید و صالح ہیں ان کی اولاد میں چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ لڑکیوں کے نام آل زہرا (نگہت) مثال زہرا (نزہت) (یہ دو تو ماشاء اللہ جوان ہیں) فرحت اور حنا۔ بڑا لڑکا تقدیس حسن سلمہ ہے جو انٹر میں تعلیم پا رہا ہے۔ دوسرا سعید الحسن ہے جو کم سن ہے۔

(۳) ڈاکٹر سید توصیف الحسن ایم ایس سی۔ پی۔ ایچ ڈی۔ ان کی شادی ان کی خالہ زاد لڑکی سے ہوئی جس سے ۵ لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

لڑکیاں:۔ احسان زہرا (کامنی) فیضان زہرا (ہما) ارمان زہرا (زیبا) اور ریحان (صبا) ذیشان۔ انعام زہرا (دیبا) عطائے حسنین (ہمایوں جو سب سے چھوٹا ہے)

توصیف سلمہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گئے کئی سال وہاں رہے پھر ان ڈیپوٹیشن (طرابلس لیبیا) یونیورسٹی میں فزکس کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو کر چلے گئے۔ چار سال سے وہیں ہیں۔ سات ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے مع اہل وعیال وہیں رہے۔ چونکہ وہاں کی مدت ملازمت ختم ہونے والی تھی لہذا جولائی ۸۲ء میں جب وہ انڈیا آئے تو بال بچوں کو ساتھ لے آئے یکم ستمبر کو وہ تنہا واپس گئے۔ انشاء اللہ جنوری ۸۳ء میں پھر علی گڑھ آجائیں گے علی گڑھ میں سرسید نگر میں یونیورسٹی سے قریب انھوں نے اپنی شاندار کوٹھی بنوائی ہے۔

ڈاکٹر توصیف سلمہ نہایت بلند کردار خوش مزاج اور بہترین عادات و خصائل کے انسان ہیں قومی ہمدردی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ امروہہ کے بہت سے لڑکوں کو محض ان کی وجہ سے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ قریب

رشتہ داروں کی وہ مخفیانہ امداد کرتے ہیں۔ اہل امروہہ میں ان کی شخصیت بہت مقبول ہے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی ان کو امتیازی شان حاصل رہی وہ بڑے جفاکش۔ فرائض شناس اور خود دار انسان ہیں۔ اپنے سوتیلے بھائیوں سے بہت پیار اور محبت سے ملتے ہیں۔

افسوس ہے کہ بعض ناگفتہ وجوہ سے میرے خاندان کا یہ حصہ پاکستان نہ آسکا اور ہمیشہ کے لئے بظاہر ہندستان میں رہ گیا۔ اللہ تعالےٰ نجیب محمود اس حسب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

دوسری بی بی سے اولاد

پہلی بی بی سے ایک لڑکی ہونے کے بعد سات برس تک پھر کوئی بچہ جب نہ ہوا تو میں نے دوسری شادی کی جن کے بطن سے ایک لڑکی اور پانچ لڑکے ہوئے۔

(۱) پروین دولت۔ یہ لڑکی ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اس لڑکی کو مذہبیات کی طرف رجحان تھا۔ نماز روزے کی شروع ہی پابند تھی تعلیم کا شوق عمر کے ساتھ بڑھتا گیا۔ آگرہ یونیورسٹی سے اُدیب کا امتحان پاس کیا۔ میری تصنیفات میں کوئی ایسی کتاب نہیں جو اس کے مطالعے میں نہ آئی ہو یا اس نے اپنے پاس محفوظ نہ رکھی ہو۔ رسالہ نور جب سے شایع ہوا اس نے ہر سال کا فائل اپنے پاس رکھا۔ بے شمار کتابوں کے مطالعے نے اس کی مذہبی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔ اسی مطالعے کے دوران ذاکرکا شروع کی اور اس میں

اتنی ترقی کی کہ کراچی کی شیعہ خواتین میں اس کو کافی شہرت حاصل ہو گئی اور شہر کے ہر حصے میں اس کو مجلس پڑھنے کے لیے بلایا جانے لگا۔ بہترین فضائل و مصائب میرے لب و لہجے میں بیان کرتی ہے۔

میرے لڑکوں میں کسی کو ذاکری کا شوق نہ ہوا۔ اس کمی کو میری دو نواسیوں نے پورا کیا۔ ماشاءاللہ بڑی لڑکی بلقیسہ سلمہا بہت خوب مجالس پڑھتی ہے۔ میری نواسی اریبہ سلمہا جو ابھی اسکول میں ہے مجلس خوانی کا خاص ملکہ رکھتی ہے۔

پروین بڑی پاک خصلت خوش مزاج اور ملنسار ہے اس میں اپنی ماں کی بہت سی عادتیں بالخصوص اولاد کی تعلیم و تربیت میں۔

پروین کی شادی میری بہن صابرہ خاتون کے بڑے لڑکے سید عرفان حسن ایم اے بی ٹی سے ہوئی جو اب کراچی کے ایک گورنمنٹ اسکول میں سینئر ماسٹر ہیں۔ نہایت نیک طبیعت اور نماز روزے کے بڑے پابند ہیں۔ پروین کی اولاد پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

لڑکیاں۔ نازنین دولت ایم۔ ایس۔ سی جو دو سال سے پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ نہایت ذہین طالبہ ہے۔ کم عمری میں اس نے ایم اے کیا۔ ابھی ناگپور یونیورسٹی سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتی ہے۔ دوسری نسرین دولت ہے جو انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پا رہی ہے۔

لڑکے:۔ ڈاکٹر خاقان حسن سلمہ ایم ایس سی پی ایچ ڈی (کیمسٹری) چھ سال کا عرصہ ہوا کہ یہاں سے ایم ایس سی کرنے کے بعد کینیڈا کی کنگسٹن (اونٹاریو) یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور چھ سال وہاں رہ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں وہاں سے واپسی ہوئی اب کراچی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں
ملازم ہیں۔ بڑا سعید صاحب اور زرینہ طیبہ لڑکا ہو۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔
دوسرے لڑکے سید شہنشاہ حسین ہیں جو بی ایس سی کر کے مشرقی پاکستان گئے
اور سلہٹ کے میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ تیسرے سید عالی جاہ حسین ہیں جو بی۔
ایس۔ سی میں تعلیم پاتے ہیں چوتھے سید آصف حسین جو ہائی اسکول میں زیر تعلیم ہو۔
پانچواں لڑکا سلیمان حسین ہو جو پانچویں درجہ میں تعلیم پا رہا ہو۔

اپنے لڑکوں کے حالات بیان کرنے سے پہلے اتنا لکھنا ضروری ہو کہ ان سب
کی تعلیم و تربیت اور ترقی میں ان کی مرحومہ ماں کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔
مرحومہ کو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا جتنا شوق تھا کم ماؤں کو ہوتا ہو۔ اس
شوق میں انہوں نے اپنے تمام شوقوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ بچوں کی تعلیم
میں انہوں نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ والد کی جائداد فروخت کرنے کے بعد
جتنا روپیہ مجھے ملا تھا اس کا زیادہ حصہ اس تعلیم میں خرچ ہوا۔ ان کو زیور
کا شوق نہ تھا وہ کہا کرتی تھیں میرا زیور میری اولاد ہے۔ ان ہی کی ان تھک کوششوں
کا نتیجہ تھا کہ ان کی ساری اولاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر ان کی زندگی ہی میں اعلیٰ
عہدوں پر پہنچ گئی۔ وہ بڑی خوش نصیب تھیں کہ سب کی شادیاں کر کے اور
ان کی اولاد دیکھ کر دنیا سے گئیں۔

ان بی بی سے حسب ذیل لڑکے ہوئے۔

(۱) سید شمیم احسن:- پروین کی ولادت کے دو برس بعد شمیم میاں پیدا ہوئے

تاریخ ولادت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۲ء مطابق دوسری جمادی الاول ۱۳۳۱ھ ہے ۔ ماشاءاللہ
صورت شکل کے لحاظ سے نہایت وجیہ و شکیل بچپن ہی سے ترقی کے آثار پیدا تھے ۔

بالائے سرش ز ہوشمندی ~ می تافت ستارۂ بلندی

ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے ہائی اسکول مرادآباد سے پاس کیا ۔ مختلف جلسوں میں تقریریں کر کے اور نظمیں پڑھ کر ۲۵-۳۰ انعام تمغوں، کتابوں اور کپوں کی صورت میں حاصل کئے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد مرادآباد نشرہ کالج میں داخلہ لیا ۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے سٹیٹسٹکل پاس کیا ۔

۱۹۳۵ء میں ان کی شادی میری بھانجی عامرہ خاتون سے ہوئی ۔ اس بی بی سے دو بچے ہوئے ایک لڑکی فرزانہ دوسرے لڑکا علی تمیم ۔ لڑکے کی ولادت کے چند ماہ بعد عامرہ کا انتقال ہو گیا اور چند روز بعد بچہ بھی رخصت ہوا ۔ فرزانہ اپنی والدہ کی پرورش میں رہی ۔ جمیم ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے آئے ۔ اور حبیب بینک میں ملازم ہو کر کراچی آ گئے ۔

۱۹۵۰ء میں جب ہم لوگ کراچی آئے تو عرفان حسن بھی ملازم ہو گئے تھے ۔ فرمان حسن اور ندیم زیر تعلیم تھے ۔ نسیم علی گڑھ سے بی ایس سی انجنیر ہو کر آئے تھے یہاں آ کر مجھے شمیم سلمہٗ کی شادی کی فکر ہوئی ۔ خلیفہ سعادت حسین صاحب کی بھتیجی لڑکی نا کتخدا تھی ۔ میں نے اس کے لئے پیغام دیا ۔ لڑکی کی ماں نے جس کو میں نے بیٹی بنایا تھا میری خواہش کو رد کیا اور شادی ہو گئی ۔ یہ شمیم میاں کی خوش نصیبی تھی کہ ایسی سلیقہ شعار اور حسن اخلاق کی پیکر بی بی مل گئی جس نے میرے خاندان کو اپنے دام محبت میں مسخر کر لیا اور وہ عزت حاصل کی جو بہوؤں کو سسرال میں کم

حاصل ہوتی ہے جتنی خوبیاں ایک شریف عورت میں ہوتی ہیں وہ سب ان کے ہیں۔ گھر کے انتظام میں نہایت چاق چوبند۔ صائب الرائے نہایت ملنسار۔ شوہر کی انتہائی فرماں بردار۔ نماز روزہ کی بڑی پابند ان کا اصلی نام میمونہ بیگم۔ اور سسرالی خطاب سرکار دلہن ہے۔

شمیم میاں کے اس بی بی سے چار اولادیں ہیں اور پہلی سے ایک فرزانہ۔

(۱) فرزانہ شمیم۔ انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پا رہی ہے بڑی نیک اور پیاری لڑکی ہے۔

(۲) رعنا شمیم۔ بڑی خوب صورت شاندار اور ہنس مکھ بچی ہے۔ ہائی اسکول میں تعلیم پا رہی ہے۔

(۳) رابعہ شمیم۔ بڑی ہوشیار اور چست و چالاک لڑکی ہے چھٹے درجے میں تعلیم پا رہی ہے۔

(۴) فردوس شمیم۔ ماشاء اللہ بڑا ہونہار لڑکا ہے ہمیشہ ہر امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کرتا ہے کھیلوں میں زیادہ حصہ لینے کی وجہ سے صحت بہت اچھی ہے۔ تیرنا بہت خوب جانتا ہے نویں درجہ میں تعلیم پا رہا ہے۔

(۵) علی شمیم۔ بہت پیارا بچہ ہے کم سن ہے نیچے درجوں میں تعلیم پا رہا ہے۔

ہمارے کراچی آنے کے بعد شمیم سلمہ چند سال کراچی میں رہے۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا تبادلہ گوجرانوالہ حبیب بینک کو ہو گیا۔ دو تین سال وہاں رہے اب ان کی تنخواہ گیارہ سو روپیہ ماہوار تھی۔

اس کے بعد حبیب بینک کی ملازمت ترک کر دی اور یونائیٹڈ بینک میں لگ گئے جب سے اب تک اسی بینک میں ہیں پہلے وہ راولپنڈی بھیجے گئے وہاں سے ان کا تبادلہ بحیثیت چیف منیجر ڈھاکہ کو ہو گیا۔ زمانہ قیام ڈھاکہ میں وہ مع اپنی

بیگم کے ممالک یورپ کی سیر و سیاحت کو گئے۔ مصر، روم، لندن، پیرس، جرمنی،
ہالینڈ، سوئزرلینڈ اور بیروت وغیرہ گئے اس سفر میں تقریباً تیس ہزار روپیہ خرچ
ہوا۔ قسم قسم کی مشینیں وغیرہ اپنے ساتھ لائے۔

جنوری [illegible] میں ان کا تبادلہ کراچی ہوا۔ آٹھ ماہ بعد لاہور کا ہوا۔
اس کے بعد پھر کراچی آگئے۔ اب بحمد اللہ سوا [illegible] ہزار ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ بنگلہ، کار،
ڈرائیور وغیرہ سب فری ہے سب ملا کر تقریباً سات ہزار ہو جاتے ہیں۔

شمیم سلمہ کو میں فیمیلی بلڈر یا خاندان ساز کہتا ہوں کیونکہ انہوں نے ہی
یہاں آکر اپنے بھائی بہن کو بلایا ان ہی کی وجہ سے نہ صرف ہم آئے بلکہ میری دو
بہنوں کے خاندان آئے۔ انہوں نے ہی اپنے بھائیوں کو تعلیم دلائی۔ شمیم بہت
سیر چشم کشادہ دست اور عالی حوصلہ انسان ہیں۔ صلہ رحم کا بہت خیال رکھتے ہیں
اپنے والدین کے نہایت اطاعت گزار ہیں۔ وہ میرے باغ کے گل سر سبد ہیں۔ جامع
امامیہ کا شمالی دروازہ انہوں نے دو منزلہ بنوایا ہے جس کا نام باب ظفر ہے۔
اب ایک ہزار گز زمین میں کراچی میں اپنی شاندار کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
بحق محمد و آل محمد اس کو بخیر و خوبی اختتام تک پہنچائے اور وہ اپنے بچوں کی بہار
دیکھیں۔

نسیم محسن

(۲) سید نسیم احسن نے مکینیکل اور الیکٹریکل انجینئرنگ کا امتحان علی گڑھ یونیورسٹی
سے پاس کیا تھا۔ [illegible] میں ان کی شادی سید علی رضا صاحب مرشد آبادی کی
صاحبزادی سے ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ہمارے ساتھ پاکستان آئے۔ جولائی ۱۹۵۰ء

میں بہ حیثیت انجنیئر ان کا تقرر اوکاڑہ کاٹن ملز میں ہوا۔ مگر چند ماہ بعد جب اُن کو کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی میں ملازمت مل گئی تو وہ کراچی چلے آئے سنہ ۱۹۵۲ء میں وہ کارپوریشن کی طرف سے انجنئرنگ میں امتیازی ڈگری حاصل کرنے کیلئے انگلینڈ بھیجے گئے۔ دو سال ان کا وہاں قیام رہا واپسی میں کارپوریشن میں اپنے فرائض انجام دینے شروع کئے۔ چند سال بعد وہ ویسٹ وارف والے پاور ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے اور مع اہل و عیال وہیں رہنے لگے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں اٹامک انرجی کمیشن نے کارپوریشن سے آن ڈیپوٹیشن ان کو دو سال کے لئے ایڈوائزر کی پوسٹ پر ان کو مانگ لیا۔ اب ان کی تنخواہ ڈھائی ہزار سے اور چھ سو روپیہ ماہوار مکان کا کرایہ ملتا ہے۔

نسیم سلمہ بڑا پیارا بیٹا ہے۔ والدین کا انتہائی فرمانبردار۔ نرم دل۔ منکسر۔ مزاج سادہ طبیعت غرور و تکبر سے دور۔ میری تربیت کا میرے تمام لڑکوں میں یہ اثر ہے کہ وہ رشوت کے قریب نہیں جاتے۔ لقمہ حرام کے پاس نہیں پھٹکتے۔ صرف اپنی تنخواہ پر قناعت کرتے ہیں۔ مکر و فریب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ غرور و تکبر کو وہ جانتے ہی نہیں خوشامد و چاپلوسی کے عادی نہیں اپنے فرائض سے غفلت نہیں کرتے۔

نسیم کی ولادت سنہ ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ نسیم سلمہ اپنی ڈیوٹی کے بڑی سختی سے پابند ہیں۔ چاہے کوئی حالت ہو وہ اپنے ہر فرض کے پابند رہتے ہیں۔ رخصت بہت کم لیتے ہیں۔ لمبی رخصت لے کر آرام کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ کام کی زیادتی نے اور آرام کم ملنے نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا ہے۔ غصہ بہت جلد آجاتا ہے۔

نسیم سلمہ کی بی بی مہ جبین بیگم جن کا سسرالی خطاب ممتاز دلہن ہے محبت کا مجسمہ اور نیکی کا پیکر ہیں ان کے بطن سے حسب ذیل اولاد ہے۔

(۱) ریحانہ نسیم بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ بی ایس سی کے آخری سال میں ہے۔

(۲) فرحانہ نسیم بڑی سنجیدہ اور ذہین لڑکی ہے۔ انٹر کے دوسرے سال میں ہے۔

(۳) طلعت نسیم ساتویں درجہ میں ہے (۴) نادرہ نسیم (۵) ذکیہ نسیم نیچے کے درجا میں ہیں۔

(۶) سید جعفر نسیم ہائی اسکول میں ہے بہت خوب لڑکا ہے۔

(۷) حسن نسیم چھٹے درجہ میں پڑھتا ہے ماشاءاللہ سب بچے تعلیم کے شوقین ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر سید ندیم الحسن۔ بی ایس سی ایم بی بی ایس ۲۶ فروری سنہ ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد پاکستان چلے آئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ یہ میری اور ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہر سال پاس کرتے چلے آئے۔ ورنہ یہ امتحان ایسا سخت ہے کہ بہت ہی کم لڑکے پانچ سال میں پاس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہوجانے کے بعد ان کو چائنا نیوی گیشن میں چودہ سو روپیہ ماہوار کی ایک جگہ شپ سرجنی کی مل گئی اور ہانگ کانگ سے ہیڈ کوارٹر مقرر ہوا۔ اِس سلسلے میں انہوں نے بہت سے ملکوں کی سیر کی اور خوش قسمتی سے حج بھی کرلیا۔

مکہ میں جاپان کمپنی کی طرف سے جو ڈسپنسری تھی یہ اُس کے انچارج تھے اُسی سال میری چچی بی بی حج کرنے گئی تھیں اُن کے ساتھ میرے کئی ہم وطن بھی تھے۔ ندیم کو ان کی خدمت کا خاص طور سے موقع ملا۔ ایک سال جب وہ کراچی آئے تو ان



سید شمیم الحسن نقوی
ایم اے ایل ایل بی



سید تسنیم الحسن نقوی انجینیر
بی ایس سی



ڈاکٹر سید ندیم الحسن نقوی
ایم۔بی۔بی ایس



سید نسیم الحسن نقوی
بی ایس سی انجینیر

کی والدہ نے پیران کو نہ جانے دیا اور وہ خود بھی شب و روز کے سفر میں رہنے سے اکتا گئے تھے۔ کراچی میں انہوں نے پرائیویٹ پریکٹیس شروع کی۔ خداوند عالم نے ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی کہ یوماً فیوماً ان کی آمدنی بڑھتی رہی کئی سال سے ان کی ڈسپنسری رضویہ کالونی کے قرا خانے کے پہلو میں ہے۔

انہوں نے دستگیر کالونی میں اپنا مکان بھی بنوالیا ہے کئی سال سے اسی میں رہتے ہیں۔ نارتھ ناظم آباد میں ایک چھ سو گز کے پلاٹ پر ایک نہایت شاندار کوٹھی بنوائی ہے ابھی اس کے مکمل ہونے میں کچھ کسر ہے۔

ندیم سلمہ کی شادی لکھنؤ کے ڈاکٹر سید ہدایت حسین صاحب مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی رئیس بانو سے ہوئی جن کا سسرالی خطاب تاج دلہن ہے یہ انٹرمیڈیٹ پاس ہیں۔ نہایت ہوشیار سلیقہ شعار اور اطاعت گذار ہیں ان کے بطن سے اب تک چار بچے ہوئے ہیں۔

(۱) عندلیب زہرا عرف ملکہ بہت غیر معمولی ذہین لڑکی ہے پانچویں درجہ میں تعلیم پاتی ہے (۲) مرتضیٰ ندیم تیسرے درجہ میں ہے (۳) گل زہرا (۴) مجتبیٰ ندیم ابھی کم سن ہیں۔

ندیم سلمہ نہایت خوش طبع اور ملنسار ہیں صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ گھر کے اندر ہر شے کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ صلۂ رحم کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اعزہ میں جو بھی قابل امداد ہیں ان کی مدد کرتے ہیں اپنی والدہ کی طولانی علالت میں بڑے انہماک سے علاج کیا۔ اور قیمتی سے قیمتی دوائیں استعمال کرائیں مگر موت کا علاج کس کے پاس ہے۔ میری صحت کا بڑا لحاظ

رکھتے ہیں اور جو ضرورت پیش آتی ہے اسے پورا کرتے ہیں۔

طبیعت میں اشتعال جلد پیدا ہو جاتا ہے مگر فرو بھی جلد ہو جاتا ہے۔ صاف طبیعت ہیں بغض و کینہ نہیں رکھتے۔ خداوند عالم ان کو صاحب عمر و اقبال کرے۔

---

(۳۰) سید قسیم الحسن بی ایس سی انجینئر ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء مطابق ۲۰ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ پیدا ہوئے۔ ہندوستان سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے آئے اور کراچی میں بی ایس سی کیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں اعلیٰ نمبروں سے سول انجینئری کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال ملازمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسوسی ایٹڈ کنسلٹنگ کمپنی میں ایک سال ملازم رہے۔ راولپنڈی میں راول ڈیم بنوایا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں پولی ٹکنک کالج کراچی میں بحیثیت سینیئر انسٹرکٹر ملازم ہوئے اسی عرصہ میں پوسٹ گریجویٹ کورسیز فاؤنڈیشن اینڈ انجینئرنگ اور ڈیزائن کا امتحان پاس کیا اور سول ٹیکنالوجی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ مقرر ہوئے

اے ایم آئی پی امتحان بھی پاس کر لیا جس کے بعد پولی ٹکنک کے دفتر میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو گئے۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں ایک سال کا ٹریننگ کرنے کے لئے امریکہ چلے گئے انشاءاللہ جنوری ۱۹۷۰ء میں واپس آ جائیں گے۔

قسیم سلمہ کی شادی صاحب خاتون بنت آغا سید محمد جعفر صاحب کاظمی سے ہوئی۔ ان کا سسرالی خطاب نازو دلہن ہے۔ یہ فرسٹ ڈویژن بی اے ہیں نہایت پاکیزہ خصلت متین طبیعت اور سلیقہ شعار ہیں۔ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں اور میری راحت رسانی کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ آپ کے بطن سے اب تک چار اولادیں ہیں۔

(۱) گلفام زہرا (۲) کلثوم زہرا (۳) معصوم زہرا (۴) سید ظفر مہدی۔ عرف شہزادہ۔

قسیم سلمہ نہایت خاموش طبیعت آدمی ہیں مگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑے چاق چوبند ہیں اپنے فرض منصبی سے غافل ہونا گناہ کبیرہ جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مدت ملازمت میں رشوت کا ایک پیسہ نہیں لیا اگر چاہتے تو بہت کچھ لے سکتے تھے اسی عقیدہ پر پختہ ہیں کہ حلال روزی میں برکت ہوتی ہے۔

(۵) سید شبیب الحسن ایم اے ایل ایل بی۔ یہ سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہوئی اور ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ولادت سے ایک سال قبل میری بی بی ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوئیں صبح سے دوپہر تک ایک تلخ لعاب ان کے منھ میں پیدا ہوتا تھا جو سخت تکلیف کا باعث تھا کبھی کبھی ایک ایسا خوفناک دورہ پڑتا تھا جس سے ہاتھ پاؤں میں سخت اینٹھن ہوجاتی تھی بعض اوقات، دورہ تین تین گھنٹے رہتا تھا اس سلسلے میں پیٹ پر ورم آگیا۔ علاج میں کوئی کوتاہی نہ تھی مگر فائدہ کچھ نہ تھا۔ سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ گرمیوں کی تعطیل میں مریضہ کو امروہے کرایا۔ ڈاکٹر سید تہورحسین صاحب کا علاج شروع کیا ایک مہینہ تک علاج رہا مگر فائدہ نہیں۔

ایک روز علاج بدلنے کے لئے قرآن سے تفاؤل کیا۔ یہ آیت برآمد ہوئی فاذا جاءھا المخاض یعنی جب مریم کو دردزہ عارض ہوا میری تعجب کی انتہا نہ رہی کہ علاج بدلنے کے لئے دردزہ سے کیا تعلق۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب سے اس تفاؤل کا ذکر کرکے کہا مجھے حمل کا شبہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ڈاکٹرنی کو دکھا دیجئے

اس کو بلایا تو اس نے تین ماہ کا حمل بتایا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنا تو کہنے لگے آپ علاج ترک کر دیجئے جو ادویہ محلل اورام ہیں وہ گرم ہیں ان سے حمل کے ساقط ہونے کا اندیشہ ہے چنانچہ علاج ترک کر دیا گیا اس کے بعد مرض نے وہ شدت اختیار کی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

خدا خدا کر کے نویں مہینہ کا آغاز ہوا۔ مراد آباد کی سول سرجن ڈاکٹرنی کو دکھایا اس نے کہا یہ ولادت خطرہ کی ہو آپ ہسپتال میں داخل کرا دیجئے۔ ورنہ مریضہ کی خیر نظر نہیں آتی گھر پہ آنے سے وقت ولادت اس نے انکار کر دیا۔ مریضہ ہسپتال جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوئیں رفتہ رفتہ وہ وقت آ گیا کہ دردِ زہ کا آغاز ہوا۔ ایک دائی اور ایک نرس کو بلا لیا تھا پوری رات گزر گئی مگر درد نہ بڑھا یہاں تک کہ دن کے دو بج گئے میں سخت پریشانی میں مکان خانہ میں کھڑا اپنے معبود سے فریاد کر رہا تھا کہ یکایک مریضہ کے بدن سے اس بلا کا پسینہ چھوٹا کہ ہر بن مو سے دھار نکل رہی تھی نرس اور دائی یہ حال دیکھ کر گھبرائیں اور کہنے لگیں آپ کسی اور کو بلا لیجئے مریضہ کی حالت خطرناک ہے۔ میں نے کہا تم دونوں ان کے پاس رہو اللہ کے فضل پر میری نظر ہے چند منٹ کے بعد دائی یہ کہتی آئی مبارک ہو لڑکی پیدا ہوئی فوراً میری زبان سے نکلا کہ لڑکی تو نہ ہونی چاہئے تھی جناب مریم کے تو لڑکا ہوا تھا اس کے بعد نرس نے خبر دی کہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تاریخ ۲۵ دسمبر تھی جو حضرت عیسیٰ کی ولادت کا دن ہے غور کیجئے یہ تفاءل کتنا درست بیٹھا۔ میرا ارادہ اسی روز سے یہ تھا کہ اپنے اس لڑکے کو عالم دین بناؤں گا مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ کالجوں کی تعلیم نے جو صاحبزادے کے سر پر جادو کا ڈنڈا گھمایا تو ایم اے میں داخلے کے بعد طبیعت کا رنگ

چل گیا۔

شبیہ میاں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے ایل ایل بی کیا۔ وکالت میں ترقی کی زیادہ گنجائش نہ پاکر یہ خیال ترک کیا۔ کچھ دن بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ کراچی کے اسسٹنٹ کنٹرولر رہے۔ پھر کچھ دن ایک پرائیویٹ فرم کے منیجر رہے۔ دو سال ہوئے یونائیٹڈ بینک میں ملازمت کرلی اب سی میں ہیں آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ نہایت صداقت پسند صاف دل اور پاک نفس ہیں۔

شبیہ میاں کی شادی ندیم سلمہ کے سالے سید آصف حسین کی صاحبزادی ممتاز سے ہوئی جن کا سسرالی خطاب نگار دلہن ہے یہ بھی بی اے پاس ہیں۔ بہت ہوشیار اور سلیقہ مند ہیں ان کے بطن سے ایک لڑکا ظفر عباس ہوا اور ایک لڑکی تازہ وارد یاسمین زہرا ہے۔

ایک عجیب واقعہ

شبیہ سلمہ کی ولادت کے بعد میری بی بی پھر ایک ہولناک مرض میں مبتلا ہوگئیں جس نے خوفناک دوروں کی صورت اختیار کرلی۔ ہر طرح کا علاج کیا گیا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میرے ایک عزیز نے کہا میرا گمان غالب یہ ہے کہ ان پر جادو کا اثر ہے۔ میں نے پہلے تو ان کی بات نہ مانی جب زیادہ اصرار کیا تو میں نے کہا کوئی ہو تو اس کو بلا کر معلوم کرو وہ ! پروہ سے ایک شخص کو لے آئے اس نے کہا

پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جادو ہے یا نہیں۔ تھوڑی سی سرسوں دیکر کہا:- ہم
میں جتنے آدمی ہیں وہ اسے کہنی سے نیچے ہاتھ کے گٹے تک ملیں اور تو کسی پر اثر نہ ہوا
مگر میری بی بی نے کہا مجھے سوزش محسوس ہوتی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ ان پر جادو
کیا گیا ہے اس کے بعد اس نے ایک کوری ہانڈی میں تھوڑا سا لوبان لوہے کی ایک
کیل اور تانبے کا ایک سانپ بنا کر ڈالا اور مجھ سے کہا اسے لے جائیے اور مریضہ سے
کہیئے اسے ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹکا دیں جوں ہی ایسا کیا ایک خوفناک آواز کے ساتھ
اس میں سے ایک شعلہ برآمد ہوا۔ میں نے فوراً ہانڈی ان کے ہاتھ سے لیکر زمین پر
رکھ دی اور ان کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اس شخص نے کچھ کنکریاں دم کر کے اس پر
ماریں فوراً شعلہ غائب اور دھواں ختم۔ اب اس نے ہانڈی کو ایک کپڑے میں
باندھ کر کہا کوئی شخص اسے لے جا کر دریا میں چھوڑ دے اسے راستے میں کھولے نہیں
ورنہ جان کا خطرہ ہے جب اس کو کر کر پانی کی سطح پر رکھا جائے گا یہ چکر کھا کر پانی
میں بیٹھ جائے گی میں نے یہ کام اپنے ایک عزیز کے سپرد کیا۔ جیسا اس نے کہا تھا
ویسا ہی ہوا۔

پھر اس نے تھوڑی سی سرسوں دے کر کہا اسے کسی گملے وغیرہ میں بو دیجئے
جب پودے نکل آئیں تو ناریل کا ایک گولا اوپر سے کاٹئے اور وہ پودے اس
میں بھر کر کٹا ہوا حصہ منہ پر رکھ کر گولے کو آٹے میں لپیٹ دیجئے۔ اور اس کو بھی
دریا میں وہیں چھوڑا جائے جہاں ہانڈی چھوڑی گئی تھی جس وقت یہ گولا سطح آب پر
رکھا جائے گا مریضہ کے پیٹ میں قراقر ہوگا اور ایک اجابت کے بعد جادو کا اثر
بالکلیہ زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ جیسا اس نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ جادو کی تاثیر سے
کون انکار کر سکتا ہے

میرا سفر ہندوستان

۱۹۵۰ء میں میں پاکستان آگیا تھا۔ وطن کی محبت چونکہ نوعِ انسانی کا ایک فطری جذبہ ہے لہذا اس کے ترک میں ہر انسان کو تکلیف محسوس ہوتی ہے چنانچہ میرے دل میں بھی اس خارِ غم کی خلش باقی رہی لیکن واقعاتِ زندگی نے کچھ ایسی نوعیت اختیار کی کہ تقریباً بیس سال تک وطنِ مالوف کی پُرزور کشش سے اپنے قلب و دماغ کو جبراً و قہراً بچائے رہا۔ اس اجمال کا مختصر بیان یہ ہے کراچی پہنچ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہماری مذہبی تعلیم کا یہاں کیا بند و بست ہے بالخصوص واعظین بنانے کیلئے اس جستجو میں پشاور تک ایک لمبا سفر کیا لیکن اس تفتیش میں بڑی حد تک ناکامی ہوئی اور یہی ناکامی اس کا سبب بنی کہ میں نے کراچی میں مدرسۃ الواعظین کی بنیاد ڈالی چنانچہ ۱۹۵۰ء سے میری کوششوں نے اپنی دشوار گزار منزلوں کو طے کرنا شروع کیا۔ ہر نیک امر میں توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوتی ہے۔ بحمداللہ چھ سال کی دوڑ دھوپ کے بعد میں جامعہ امامیہ کی تعمیر کے کام سے فارغ ہو گیا۔ یہ عمارت ناظم آباد نمبر ۲ میں ۲۱۳۲ گز زمین میں پھیلی ہوئی ہے جس میں ۱۶ کمرے ہیں دو طویل و عریض ہال اور ان کے آگے دو خوب صورت عالی شان برآمدے تین فلیٹ، دو کانیں ایک مسجد اور ایک موذن کا مکان ہے۔ نیچے کے ہال میں لائبریری ہے جس میں دس بڑی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی ہیں۔

۱۹۵۶ء سے اس میں تعلیم کا آغاز ہوا جو بحمداللہ بہترین صورت میں آج تک قائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

جامعہ امامیہ کی مصروفیت نے میرے خیال کو کسی اور طرف جانے ہی نہ دیا۔ جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو ایک اور دشوار گزار منزل سامنے آئی۔ فرقۂ شیعہ کی کتب احادیث چار ہیں۔ کافی۔ تہذیب الاحکام من لا یحضرہ الفقیہ اور استبصار۔

صدیاں گزر گئیں کہ ان میں سے کسی ایک کا ترجمہ بھی اردو میں نہ ہوا۔ اور مومنین کرام قطعاً اس سے بے خبر رہے کہ ہمارے ائمہ طاہرین نے اصول اور فروع دین کے کیا فرمایا ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے کافی کے ترجمے کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوا کیونکہ کتب احادیث میں اس کا نمبر اول ہے۔ چار سال کی محنت شاقہ کے بعد اصول کافی کی دونوں جلدوں اور فروع کافی کی ایک جلد کے ترجمے سے فارغ ہوا تینوں حصے ہیں بحمد اللہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکیں ایک جلد چھپنی باقی ہے۔ اب میری مصنفات کی تعداد بحمد اللہ ۱۴۸ ہو گئی۔

اس کام سے فراغت کے بعد جب دل و دماغ کو ذرا سکون حاصل ہوا تو اپنا وطن امروہہ یاد آیا اور اعزا اور احباب کی محبت نے بری طرح دامن دل کو کھینچا ۱۵ اگست ۱۹۷۶ء کو میں کراچی سے روانہ ہوا۔ اور لاہور سے اپنے نواسے سبطین سلمہ کو ساتھ لے کر امروہہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچا تو میرے دونوں لڑکے ڈاکٹر توصیف الحسن پی ایچ ڈی، تہذیب الحسن سلمہما اور میری سالی کے لڑکے اقبال رضا سلمہ استقبال کو موجود تھے ان کو دیکھ کر ایک تازہ روح بدن میں آ گئی۔

توصیف سلمہ چار سال سے لیبیا یونیورسٹی میں بحیثیت فزکس کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہندوستان چھٹی آئے ہوئے تھے آج ہی انہیں شام کو لیبیا کے لئے روانہ ہونا تھا اسی لئے وہ میرے ساتھ امروہہ نہ آ سکے۔ یہ [illegible] کا ملنا ہم دونوں کے جذبات محبت کو جس قدر گدگدی کر رہا تھا اس کا اندازہ ہم دونوں ہی کر سکتے ہیں۔ کاش پاسپورٹ اور ویزا جلد مل گیا ہوتا اور مجھے چند روز ساتھ رہنے کا موقع مل گیا ہوتا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میں نے تہذیب سلمہ کو لکھا تھا کہ میں ۲۰ اگست کو پہنچوں گا اور ۲۲ کو امروہہ پہنچوں گا مگر لاہور ایک دن اس لئے قیام کرنا پڑا کہ میرے نواسے سبطین کو اس روز تک ویزا نہیں ملا تھا چنانچہ میری تحریر کی بنا پر میرے اعزہ و احباب گلدستے لے کر اسٹیشن پر پہنچے۔ مگر ناکام واپس آئے دوسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے روز جب میں پہنچا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ دو روز کی ناکامی کے بعد ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

میں اور سبطین سلمہ جب گھر پہنچے اور اعزہ و احباب کو میرے آنے کی خبر ملی تو زن و مرد سے سارا گھر بھر گیا۔ اسی دن سے شہر والوں کا ایسا تانتا بندھا کہ آخر روز تک نہ ٹوٹا۔ صبح سے دوپہر تک اور دوپہر سے دس بجے رات تک لوگ برابر آتے جاتے رہے۔ دوپہر کو مجھے کھانا کھانے کی فرصت بھی مشکل ہی سے ملتی تھی۔ جو سنتا تھا کہ میرا ویزہ صرف پندرہ روز کا ہے وہ کہتا تھا ویزہ ہم بڑھوا کر دیں گے۔

میرے دل میں سب سے زیادہ تڑپ اپنی بہن اور اپنے بڑے لڑکے تہذیب الحسن سلمہ کی بی بی اور بچوں کو دیکھنے کی تھی ان سے دل کھول کر ملا اور اپنی محبت کے پھول نچھاور کئے۔ دوسری حسرت اپنی ماں باپ کی قبروں کو بوسہ دینے اور فاتحہ پڑھنے کی تھی چنانچہ دوسرے ہی روز اس شوق کو پورا کیا۔ اسی سلسلہ میں اپنے جد اعلیٰ حضرت شرف الدین شاہ ولایت کی درگاہ میں حاضری دی اور عقیدت کے پھول چڑھائے۔

ڈاکٹر توصیف سلمہ کی بیگم مع اپنے بچوں کے اور میرے ہم زلف سید ناظر رضا مع اپنے اہل و عیال کے علی گڑھ سے [illegible] پہنچ گئے ان کے آنے سے چہل پہل اور زیادہ ہو گئی اور رشتہ داروں کے کئی روز مہمان رہنے سے اچھا خاصہ شادی کا گھر معلوم ہونے لگا

مختصر یہ کہ انتہا آ پذیرائی جو عمل میں آئی۔ اہل شہر اور اعزا نے جس گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

توصیف میاں نے میری آمد کے سلسلے میں امروہہ اور علی گڑھ کے لئے ایک بہت بڑا پروگرام بنایا تھا افسوس ہے کہ اس کے پورا کرنے کی حسرت دل میں لئے وہ لیبیا روانہ ہو گئے۔ اگر وہ ہوتے میری خوشی میں بڑا اضافہ ہو جاتا تاہم ان کے اہل و عیال کے آجانے سے میری مسرت میں اضافہ ہوا۔ بیگم توصیف نے دوسرے ہی روز ایک مجلس کا اعلان کرایا جو محمد حقانی کے عزا خانے میں ہوئی۔ مجمع بہت زیادہ تھا۔ سوز خوانی کے بعد قوم کے پرجوش کارکن میرے بڑے مخلص عزیز ماسٹر سید شجاع الحسن صاحب نے نہایت جوش میں میرے آنے کی خوشی میں نہایت دلپسند چند قطعات پڑھے۔ اس کے بعد میں منبر پر گیا۔ پہلے تو بیس سال تک امروہہ نہ آسکنے کی وجہ بیان کی۔ اس کے بعد فضائل و مصائب بیان کئے۔ بعد مجلس میرے ہم وطن جس والہانہ انداز میں مجھ سے ملے اس کو میں اپنے لئے سرمایہ صد افتخار سمجھا۔

میرے آنے کے دوسرے ہی روز سے بے شمار لوگوں کی یہ خواہش ہوئی کہ میں ان کے یہاں ایک وقت کھانا کھاؤں۔ میں حیران تھا کہ اس تقاضائے محبت کی تعمیل کیسے کروں قیام کے دن کم اور دعوتوں کی تعداد اتنی زیادہ کہ دو ماہ بھی ان کے لئے کافی نہ ہوتے میرے۔ یہ سخت کشمکش کا وقت تھا کینہ والے چاہتے تھے ان کے یہاں کھاؤں بل منبر جانتے تھے ان کے یہاں۔ کچھ میں نہ آتا تھا کس کو ترجیح دوں آخر یہ کہہ کر بہت سے لوگوں سے معذرت خواہ ہوا کہ ویزا بڑھ جانے کے بعد غور کروں گا لیکن بیس روز کا ویزہ بڑھنے پر بھی سب فرمائشیں پوری نہ ہوئیں۔

میں کمی مجھے ندامت رہی اور ان سب سے معافی کا طالب ہوں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔ جن حضرات کی تقریبات میں مجھے شرکت کا شرف حاصل ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

سید مظفر حسین صاحب محلہ حقانی۔ سید متبرک حسن سلمہ محلہ حقانی۔ ڈاکٹر سید محب حسنین صاحب محلہ گندری۔ سید سجاد حسنین صاحب۔ سید مبارک حسن صاحب محلہ کلا پوتہ۔ سید زوار مہدی سلمہ محلہ حقانی۔ حاجی سید ضمیر علی صاحب محلہ حقانی۔ ماسٹر سید شجاع اختر صاحب محلہ دربار شاہ ولایت۔ سید انعام حسین صاحب۔ محسنین محلہ شفاعت پوتہ۔ سید ذوالفقار حسین محلہ حقانی۔ سید تقی ہادی صاحب۔ سید نور عین سلمہ محلہ گندری۔ سید محمد رضا صاحب محلہ گندری۔

ان کے علاوہ دو حضرات ایسے تھے جن کی دعوت کا شرف حاصل نہ ہو سکا اور کوتاہی وقت کی بناء پر مجھے ان سے معافی مانگنی پڑی۔

ان ہی ایام میں میری پوتی آل زہرا عرف نگہت سلمہا کا عقد عزیزم سید متبرک حسن سلمہ کے صاحبزادے سید تنویر حسن سلمہ سے ہوا۔ اس عقد میں جن احباب نے شرکت کی ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس عقیدت کی بنا پر جو سید شجاع اختر صاحب کو مجھ سے ہے انہوں نے اس موقعہ پر ایک مختصر سہرا اور چند قطعات نظم کر کے سنائے جو سب کو پسند آئے۔ شجاع اختر صاحب فرط محبت سے روزانہ صبح و شام میرے پاس آتے رہے۔

بتقریب ولادت جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ہر سال جو مجلس امام باڑہ مسماۃ صغرا مرحومہ محلہ گندری میں ہوا کرتی ہے اہل شہر کی خواہش پر یہ مجلس میں نے پڑھی۔ مجلس سے قبل عزیزی سید محمد رضا صاحب نبیرۂ جناب رئیس المناظرین مولانا سید اعجاز حسین صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے جیسی شاندار چائے پارٹی کی اس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں

میرے منبر پر جانے سے پہلے سید تقی ہادی صاحب اور سید نثار حسنین صاحب نے میری عملی زندگی کے متعلق جو کچھ فرمایا اور میری تعریف و توصیف میں جو بیش قیمت الفاظ کہے گئے انہوں نے شرم سے میری گردن جھکا دی ورنہ میں کیا۔ اور میری خدمات کیا۔ میرے ویزہ میں توسیع ہوتی تو مگر بہت دوڑ دھوپ اور خرچ کثیر کے بعد۔

مولانا سید صفی مرتضیٰ صاحب کا انتقال

مولانا سید صفی مرتضیٰ صاحب ایم اے جو ساوات۔ امروہہ میں ایک مقبول ترین اور ہر دلعزیز ہستی تھے میرے دورہ امروہہ کے چند روز بعد اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ چونکہ ان کی پاکیزہ نفسی نے اہل امروہہ کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا اس لئے ان کی موت نے ہر فرد قوم کو مغموم و محزون بنا دیا۔ ان کی موت کے سلسلہ میں محلہ گزری کے عزا خانہ میں دو مجلسیں میں نے پڑھیں۔

یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہے کہ امروہہ کی دو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل قدر ہستیاں بصارت سے محروم ہو گئیں۔ ایک جناب سید مختار حسن صاحب اور دوسرے الحاج مولانا سید نقی علی صاحب یہ دونوں صاحب گورنمنٹ کالجوں کی پرنسپلی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ بحمد اللہ دونوں کی بصیرت سے قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ دونوں صاحبان سے میرے گہرے تعلقات رہ چکے تھے۔ سید مختار حسن صاحب کے دولتکدہ پر جا کر چار بار ملا۔ مگر مولانا نقی علی صاحب کی خدمت میں ایک بار سے زیادہ جانے

کا موقعہ نہ ملا افسوس ہے کہ اپنی مصروفیتوں کے پیش نظر میں اپنے محترم عزیزانِ وطن کی بازدید کے لئے کہیں نہ جا سکا۔

دورانِ قیام امروہہ سید مختار حسن صاحب کی صاحبزادی کی شادی جناب حجۃ الاسلام مولانا سید محمد ذکی صاحب قبلہ مجتہد آل نجم العلماء کے صاحبزادے سے ہوئی برات لکھنؤ سے آئی تھی اس تقریب مسعود میں ایک مختصر سی مجلس مجھے پڑھنا پڑی۔

انجمن تحفظ عزاداری کا جلسہ

میرے ہموطنوں نے جس خلوص و محبت سے میرا خیر مقدم کیا شاید وہ میرے ہی لئے مخصوص ہو گیا جیسی عزت افزائی اور دل نوازی کو مدت العمر فراموش نہیں کر سکتا جتنی اعزازی صورتیں ہو سکتی تھیں ان سب سے مجھے نوازا اور اپنے احسانات کا ایک بارِ عظیم میرے اوپر لاد دیا۔ اس سلسلہ میں انجمن تحفظ عزاداری کا ایک جلسہ عزیز محترم سید تقی ہادی صاحب کے دولتکدہ پر میرے اعزاز میں ہوا جس میں اکثر ممبرانِ انجمن نے شرکت کی۔ ٹی پارٹی میں شرکت کے بعد اول سید محمد مجتبیٰ صاحب نے پھر سید سجاد حسین اور تقی ہادی صاحبان نے میری آمد کے سلسلے میں تقاریر کیں میرے متعلق جو کچھ کہا گیا وہ افراطِ محبت کا تقاضا تھا جس کا میں شکر گزار رہوں۔ اس انجمن کی عملی کارروائیوں کو سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اس ترقی پر اراکینِ انجمن کو مبارکباد دی جس نے قوم کے مستقبل کو تابناک بنانے کی داغ بیل ڈالی ہو نقوش چودہ معصومین کی تعلیم کا سرمایہ ہے جو عزاداری میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے پر پنپنے کے لئے ہے۔

چند پُر لطف صحبتیں جیسا کہ پہلے لکھ چکا میرے زمانۂ قیام میں صبح سے شام

تک اور نماز مغربین کے بعد سے رات کے دس بجے تک عزیزان وطن کا مجمع میرے گرد رہتا تھا۔ بسا اوقات مجھے اندر اگر اپنی رشتہ دار خواتین سے بات کرنے کا موقع بھی نہ ملتا تھا اور وہ بغیر ملے چلی جاتی تھیں۔ ان صحبتوں میں گاہ گاہ شعر و سخن کا بازار بھی گرم ہو جاتا تھا جناب الحاج مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ امام جمعہ و جماعت اور جناب محترم سید فصاحت حسین صاحب اور عزیز مکرم سید شجاع الحسن صاحب نے قصائد اور مختلف موضوعات پر دلکش نظمیں سنائیں ان سے لطف صحبت دوبالا ہوا اور مجھے حد درجہ حظ حاصل ہوا۔ مولانا محمد عبادت کی حسب ذیل نظم مجھے اور دیگر حضرات کو زیادہ پسند آئی۔

مری کشتی اگر بیچ کے طوفان سے یک بیک ڈوب جائے تو میں کیا کروں
مرا وقت سیہ اس بڑے وقت میں یوں قیامت اٹھائے تو میں کیا کروں

مری رفتار پر پھول ہنسنے لگیں اور کلی مسکرائے تو میں کیا کروں۔
جب کہ سارا چمن ہی نہ بیر سے میری وحشت بڑھائے تو میں کیا کروں

میں جفائیں سہوں وہ جفائیں کریں ہر جفا پر مجھے بے وفا بھی کہیں
سوچ اے ہم نشیں میرے حق میں کہیں ہو یہی ان کی رائے تو میں کیا کروں

دل گرفتار ہے وہم آزاد ہے۔ آشیانہ مرا کب سے برباد ہے
جب ڈرانے لگیں چاندنی رات میں شاخساروں کے سائے تو میں کیا کروں

جس کو روشن کیا ہے بڑی چاہ سے جس کی تابندگی ہو بڑی ماہ سے
وہ دیا آپ ہی اپنی لو سے کہیں میرے گھر کو جلائے تو میں کیا کروں

روز شام و سحر پھولتی ہو شفق خوں کے رنگ میں اس میں کیا میر الحق
خون ناحق مرا بر سر آسماں اس طرح رنگ لائے تو میں کیا کروں

ان کا طرز ستم میرا ضبط الم ان کی رفتار و گفتار سے تحمل کیا
اب مری داستاں کر رہے ہیں بیاں سارے اپنے پرائے تو میں کیا کروں
کوئی دیکھے اسے کس میں تاب نظر ہو گئے غش کلیم آں بھلا کیا کہو
وہ اگر ناز سے خاص انداز سے اپنا جلوہ دکھائے تو میں کیا کروں

اسی سلسلہ میں جناب محترم سید تقی حسن صاحب پرنسپل آئی ایم سائنس کالج امروہہ نے تاریخ اصغری پر جو مقدمہ لکھا ہے مجھے اس کے متعلق دعوت غور و فکر دی میں نے بڑے شوق سے از اول تا آخر پڑھا اس سے پتہ چلا کہ ماشاء اللہ بڑے کہنہ مشق اور بہترین انشا پرداز ہیں ان کے قلم میں زور ہے ان کے دل و دماغ میں غیر معمولی تحقیقی و تنقیدی صلاحیت ہے ان کے تبصرے وزنی اور حقیقت نما ہیں وہ بڑے صبر و ضبط اور غور و تامل سے لکھنے والے ہیں کسی زیر بحث پہلو کو انہوں نے تشنہ تکمیل نہیں چھوڑا یہ مقدمہ ان کا تاریخی و ادبی شاہکار ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

آئی ایم کالج کا معائنہ

امام المدارس جب اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا مجھے بھی اس میں تعلیم پانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ہماری یہ مایۂ ناز درسگاہ اپنی ترقی کے منازل طے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہائی اسکول بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں جناب مولانا محمد مجتبیٰ صاحب عرف مولوی چاند صاحب اور خان بہادر سید محمد نبی ہادی صاحب ان کوششوں میں پیش پیش

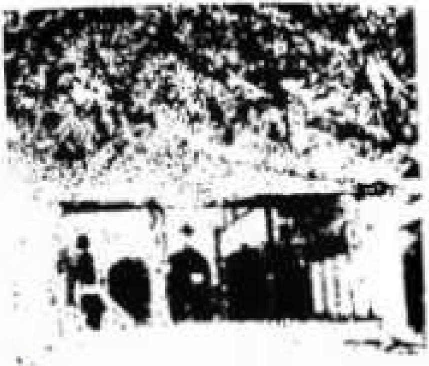
تھے ان کے ساتھ میری کوششیں بھی شامل تھیں افسوس اب سرزمین امروہہ پر وہ قوم کی مایۂ ناز ہستیاں مجھے نظر آتیں، ان کی یاد اب بھی میرے دل کو تڑپا دیتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی روحوں پر بیحد رحمت نازل کرے۔

بس یہی دولت مجھے دکھا گئے اے عمرِ رواں　　　سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا

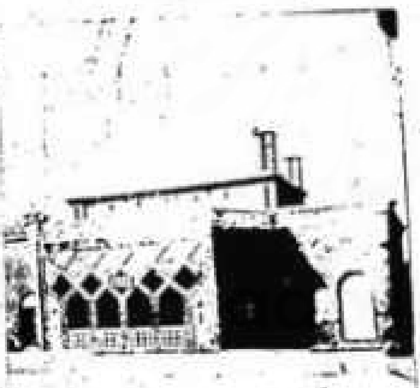
حقیقت یہ ہے کہ اس اسکول کا جواب کالج ہے سادات امروہہ پر بڑا احسان ہے کہ ان میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کر کے تمام سہولتیں مہیا کیں۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں کالج کی موجودہ حالت کو دیکھوں چنانچہ ایکدن میں چند صاحبان کے ساتھ گیا۔ سید تقی ہادی صاحب اور سید نقی حسن صاحب پرنسپل کے ساتھ گھوم پھر تمام عمارت دیکھی ماشاء اللہ بس پھلواری کی آبیاری میں میں بھی کسی وقت شریک تھا اب وہ باغ و بہار بن چکی تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر جواب تکمیل کی حد کے قریب ہے ایک ایسی مسرت کی لہر میرے دل میں اٹھی کہ الفاظ میں اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس تصور میں پھولا نہ سماتا تھا کہ یہ عالیشان عمارت ہماری ہے۔ یہ کالج ہمارا ہے۔ یہ ہم سیدوں کی قومی خدمت کا شاہکار ہے بحمداللہ اب یہ سائنس کالج ہے اور مقامی کالجوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے سائنس کے دو جدید کمرے زیر تعمیر تھے ان کو دیکھ کر اور زیادہ مسرت ہوئی ایک کمرہ فزکس کی لیباریٹری کے لئے بنایا جا رہا ہے اور دوسرا کیمسٹری کے لئے کالج کے عقب میں ابھی ٹین کے سائبانوں کے نیچے چند کلاس ہوتے ہیں لائبریری اور دفتر بھی دیکھا۔ غرضکہ ہر حیثیت سے کالج کی تمام ضروریات کو مکمل پایا پھر پرنسپل صاحب کے کمرہ میں جا کر حسب ذیل معلومات حاصل کیں۔

تعداد طلبا ۱۰۰۰ کلاس روم ۱۲ مسافتہ ۳ ۳ ۔ سائنس روم ۲ ۔ دفتر ۔۔۔ کلرک ۴



عزاخانہ محلہ حقانی
امروہہ



مدرسہ سید المدارس
امروہہ



ڈاکٹر سید خاقان - ایم ایس سی
پی ایچ ڈی



سید سبطین محمد نقوی

ہر کمرہ میں بجلی کا پنکھا. ہر کمرہ میں لاؤڈ اسپیکر تاکہ پرنسپل صاحب کے احکام بیک وقت ہر کمرہ میں سن لئے جائیں کل خرچ سالانہ ۱۲۸۸۰۱ روپیہ ہے. مجلس انتظامیہ کے ۱۰ ممبر ہیں جو امروہہ کی ممتاز ہستیاں ہیں.

سید نقی ہادی صاحب بی اے ایل ایل بی سابق ایم ایل اے امروہہ کے ایک مایہ ناز ہستی خان بہادر سید نبی ہادی صاحب مرحوم کے فرزند ہیں. یہ اس وقت سے اس درسگاہ کے منیجر ہیں جب یہ ہائی اسکول تھا. مجھے خوب یاد ہے کہ میری ہی صدارت میں وہ جلسہ ہوا تھا جس میں اس درس گاہ کی منیجری کی ذمہ داری ان کی سپرد کی گئی تھی. نقی ہادی صاحب ہزار تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سالہا سال کی جد و جہد کے بعد اس درس گاہ کو کالج تک پہنچا دیا. ان ہی کی مساعی جمیلہ سے کالج کی عمارت حد تکمیل کو پہنچی. چونکہ سالہا سال سے وہ اس خدمت کو انجام دیتے چلے آ رہے ہیں اور ایک باوقار ہستی بھی ہیں. تجربہ کا رہنما بھی ان کے ساتھ ہے. لہذا وہ ان دشوار گزار منزلوں سے گزر گئے. ایسے کاموں کے لئے بڑی جگر کاوی دماغ سوزی اور عیش و آرام کو تج دینے کی ضرورت ہوتی ہے جامعہ امامیہ کی تعمیر اور اجرائے تعلیم میں جن مصائب و آلام کا مجھے سامنا ہوا ہے اور جس دیوانگی سے دوڑ دھوپ کرنا پڑی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر میں نقی ہادی صاحب کی دقتوں کا احساس کر رہا ہوں اور یہ سمجھ رہا ہوں کہ انہیں مجھ سے زیادہ ہمت شکن مراحل کا سامنا ہوا ہوگا. کیوں کہ پاکستان میں میرے لئے ساز گار ماحول تھا ان کو یہ سہولت میسر نہ تھی.

حقیقت یہ ہے کہ میں پاکستان میں رہ کر آئی. ایم کالج کی اس ترقی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا. مرحبا صد مرحبا. یہ اور بڑا کام اس کالج کی بدولت سادات

ترقی کے بہت سے دروازے کھل گئے۔ میرے لڑکے ڈاکٹر سید توصیف الحسن سلمہ پی ایچ ڈی نے تقی ہادی صاحب کی ان ہی گرانقدر خدمات اور غیر معمولی انہماک کو دیکھ کر کہا تھا "تقی ہادی صاحب امروہے کے سر سید ہیں" کالج کے سلسلے میں ان کی بہترین خدمات کا ایک شاہکار یہ بھی ہے کہ انہوں نے کوشش کرکے محکمۂ تعلیم سے محرم کی تعطیل بھی دس روز کی منظور کرالی اتنی لمبی تعطیل تو کسی دورِ حکومت میں ہوئی ہی نہیں۔ بہر حال تقی ہادی صاحب کا دور مینیجری بہت غنیمت ہے ان کو چاہئے کہ لومۃ لائم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں لگے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ قومی کارکنوں کے نصیب میں گویا یہ لکھا ہوا ہے کہ ان کی ہر خوبی اور حسن خدمات پر مختلف زاویوں سے حملہ ہو۔ میں نے جہاں تک غور کیا تقی ہادی صاحب نے اپنی زندگی کو کالج کے خدمات کے لئے وقف کر دیا ہے وہ دن رات کالج کی فلاح و بہبود کے خیال میں غرق رہتے ہیں انہوں نے کالج کی محبت میں حصول معاش کے تمام ذرائع کو اپنے اوپر ایک بڑی حد تک بند کر دیا ہے وہ انسان ہیں غلطی کا صدور ان سے ہر وقت ممکن ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان کے زمانۂ مینیجری میں کالج نے ترقی کی ہے یا تنزل اگر ترقی کی ہے اور یقیناً کی ہے تو وہ ضرور مستحق تحسین ہیں۔

اس کالج کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ سید تقی حسن صاحب جیسا قابل آدمی آج کا پرنسپل ہے۔ بہ حیثیت سادات امروہہ کی ایک ممتاز فرد ہونے کے وہ اس کے مستحق بھی تھے پھر انہوں نے ایثار سے کام لے کر کم تنخواہ منظور کی جہاں تک تعلیمی نگہداشت کا تعلق ہے کالج کے نتائج ہر طرح اطمینان بخش ہیں مجھے ایک امر نے بہت حیرت میں ڈالا۔ پرنسپل صاحب نے طلبا کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں بڑی جد و جہد کی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اگر کوئی لڑکا اپنی کتاب، قلم یا چھتری بھول جاتا ہے یا کچھ پیسے اس کے گر جاتے ہیں

، تو دوسرے لڑکے ان چیزوں کو پاکر دفتر میں جمع کر دیتے ہیں چنانچہ دفتر پرنسپل میں جب میں موجود تھا ایک لڑکے نے چونّی لاکر جمع کی یہ خصوصیت اس کالج کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی ۔

مذکورۃ الصدر مجالس کے علاوہ میں نے امام محمد تقی علیہ السلام کی ولادت کے سلسلے میں ایک مجلس محلہ دانشمندان کے بیچ کے امام باڑہ میں پڑھی اور دوسری ۱۴ رجب کو محلہ کٹکوئی کے عزا خانے میں ۔ بعد مجلس انعام حسن صاحب کے یہاں کھانا کھایا ۔ انعام حسن صاحب خوب آدمی ہیں مذہبیات سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں ۔

آل احمد گرلس اسکول

یہ بھی ہماری قوم کا ایک سرگرم عمل ادارہ ہے جس میں ہماری لڑکیاں مڈل کلاس تک تعلیم پا رہی ہیں ۔ غریب لڑکیوں کے ساتھ ہر ممکن رعایت کی جاتی ہے اس کے منیجر فخر قوم و ملت سید سخی حسنین صاحب م بجیہ ہماری قوم کے ایک ممتاز اور تجربہ کار رئیس ہیں کئی سال امروہہ میونسپلٹی کے چیرمین رہ چکے ہیں قومی تنظیم کے سلسلے میں ان کی خدمات ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں ان کے دل میں قومی درد ہے ۔ میری دلی دعا ہے کہ ان کی سرپرستی میں یہ مڈل اسکول بھی ہائی اسکول بن جائے ۔

ممتاز قومی کارکن

میرا یہ مختصر سفرنامہ ناتمام رہے گا اگر میں ان زندہ دلان امروہہ کا خاص طور سے ذکر نہ کروں جو قومی معاملات میں پوری دلچسپی سے کام کرتے رہے ہیں اور ان کی دلی خواہش ہے کہ قوم کو جلد از جلد شاہراہ ترقی پر لگا دیں اور عزاداری امام مظلوم کا پوری طرح تحفظ کریں
سید تقی ہادی صاحب ۔ سید سخی حسنین صاحب سید محمد مجتبیٰ صاحب ۔ سید

مختار حسن صاحب۔ سید شجاع الحسن صاحب۔ سید محمد رضا صاحب۔ سید ظل سبطین صاحب۔ سید عسکری حسن صاحب۔ سید ازمان مہدی صاحب۔ سید سردار حسن صاحب۔ سید انعام حسن صاحب۔ سید تقی حسن صاحب۔ مولانا سید لقاء علی صاحب۔ مولانا سید محمد عباد صاحب۔ سید وجاہت حسین صاحب۔ سید منتظر حسن صاحب۔ سید ظفر عباس صاحب۔ سید شبیر حسن صاحب۔ کاظم علی خاں صاحب۔ سید ضمیر علی صاحب۔ سید شہادت حسین صاحب یہ وہ نام ہیں جو مجھے بتائے گئے اگر کچھ نام رہ گئے ہوں تو وہ حضرات مجھے معاف کریں۔

شکریہ میرا ویزا صرف امروہہ کا تھا اور مجھے علی گڑھ جانا اس لئے ضروری تھا کہ وہاں میرے لڑکے ڈاکٹر توصیف الحسن سلمہ نے اپنا مکان تعمیر کرایا تھا مجھے اس کو دیکھنا اور دعائے خیر و برکت پڑھنا تھی۔

علی گڑھ جانے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے کسی کو لکھنؤ بھیجنا ضروری تھا جو ایک طول عمل تھا مگر سید تقی ہادی اور سید سردار حسن کی جد وجہد سے یہ اجازت مجھے مراد آباد ہی سے مل گئی اس سلسلہ میں ان حضرات کو کئی بار مراد آباد جانا پڑا جس کا میں شکر گزار ہوں۔ ویزا بڑھوانے اور علی گڑھ کی اجازت حاصل کرنے میں میری سالی کے لڑکے اقبال سلمہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ میرے امروہہ پہنچنے کے بعد سے یہ لڑکا میرے ہی پاس رہا اور پھر علی گڑھ سے دہلی تک پہنچانے آیا بڑی ہمت والا جوان ہے۔

سادات امروہہ کی تعلیمی و اقتصادی حالت دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو ہمیشہ ایک حالت میں رہی ہو۔ الایام نداولہا بین الناس (الآیہ) یہ زمانہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ نامساعدت روزگار سے ہم بری طرح پستی کی طرف دھکیلے گئے ہیں غالباً یہ مصیبت

ہم کو ایک اچھا سبق سکھانے کے لئے آئی تھی۔ اس ہولناک جھٹکے نے ہمیں خواب غفلت سے چونکا دیا اور عمل کی ایک تازہ روح ہمارے اندر پھونک دی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے اکثر افراد تنگدستی میں مبتلا ہیں اور ان کا مستقبل بظاہر تاریک نظر آرہا ہو لیکن جہاں تک میں نے غور کیا یہ ایک عارضی بلا ہو جو ہمارے لئے ایک فال نیک ہو۔ ماشاء اللہ اب ہمارے نوجوان ترقی کے میدان میں پوری قوت سے گامزن ہیں تعلیم کی طرف رجحان بڑھتا جارہا ہو ان کی موجودہ رفتار یہ نشان دہی کر رہی ہو کہ وہ مبارک وقت آنے والا ہو کہ جس منزل سے ہم گرے ہیں پھر وہیں پہنچ جائیں گے ارادہ کا نام کامیابی ہو اور کوشش کا نام کھوئے مقصد کو پانا ہے۔ خدا کا شکر ہو کہ گم کردہ صلاحیتیں اپنے مقصد کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ ادبار کی تاریکی سے نکل کر اقبال کی روشنی میں آنا ہتھیلی پر سرسوں جمنا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہو۔ سادات کی اقتصادی حالت اتنی کمزور نظر نہ آتی اگر گرانی انتہا کو پہنچی ہوئی نہ ہوتی۔ جہاں ایک سیر کا آٹا ہو وہاں آمد و خرچ کا توازن کیسے رہ سکتا ہے۔

امروہہ کے پاکستانی باشندوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ امروہہ میں آثار حیات نہیں اور ان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہاں آکر مجھے پتہ چلا کہ بحمد اللہ ترقی کے ہر جادہ پر ان کا قدم ہو اگر یہاں سے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارے نوجوان پاکستان نہ چلے جاتے تو امروہہ کے حالات کچھ اور ہوتے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ اس وقت چار پی ایچ ڈی ہیں۔ متعدد انجینیر، متعدد گریجویٹ ہیں اور متعدد ڈپلوما پاس ہیں اور معقول تنخواہیں پا رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کی تعلیمی ترقی کو

دیجارنے میں آئی ایم کالج کا بہت بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ غریب شیعہ بچوں کو فری تعلیم دے رہا ہے یہاں کے لیڈروں کی یہ کوشش ہے کہ گرے پڑے لوگوں کو سہارا دے کر آگے بڑھائیں ۔

نچلے طبقے کے وہ لوگ جو کسی وقت سادات کے سلامی اور میراثی تھے ۔ اگر وقتی تقاضے سے متمول بن گئے ہیں ان کو دیکھ کر سادات ہرگز احساس کمتری کی بلا میں مبتلا نہ ہوں سعدی کے اس مقولہ پر نظر رکھیں " جوہر اگر در خلاب افتد ہمانہ نفیس و غبار اگر بر فلک رود ہماں خسیس ۔

میری چند خصوصیات

جہاں تک زندگی کے واقعات کا تعلق ہے میں اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز میں بیان کر چکا اب چند اپنی خصوصیات کا ذکر باقی رہ گیا ۔

مجھے تقریر سے زیادہ تحریر کا شوق رہا میرے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات مرکوز تھی کہ تقریر ہوا کا ایک جھونکا ہے ادھر سے آیا ادھر گیا ۔ ایک مقرر کی عزت شہرت اور حصول دولت میں کامیابی صرف اسی وقت تک ہے جب تک وہ زندہ ہے مرنے کے بعد کسی فضا میں اس کی آواز نہیں گونجتی ۔

میں سیدھی سادی زندگی کو پسند کرتا ہوں ۔ تکلفات سے کوسوں دور ہوں مجھے دنیا سازوں کی طرح بننا نہیں آتا ۔ بلکہ جتنا ہوں اس سے نیچا اپنے کو دکھاتا ہے ۔ میں آدمی بن کر دنیا میں رہا ہوں ۔ فرشتے کے لباس میں اپنے کو کبھی

نہیں دکھایا۔ میں نے اپنے ظاہر کو باطن سے اور باطن کو ظاہر سے جدا نہیں کیا۔ میں اپنے کسی کمال پر اترائے کہ کمال کہا جائے مغرور نہیں۔ ایسے سوا یوں سے مجھے سخت نفرت ہے جو نجتے زیادہ ہیں جو اپنے کو صفوف ملائکہ میں داخل سمجھتے ہیں۔ علم کی تمکنت میں جن کے نتھنوں سے دھواں نکلتا ہے جو اپنے سوا سب کو حقیر سمجھتے ہیں۔

جن کا تقدس میری نظر میں سما جاتا ہے میں پھر ان کا پورا پورا احترام کرتا ہوں حافظ کا یہ شعر میری زندگی کے عمل کا ایک حصہ ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است ؎ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا۔

میں نے امراء کی کبھی خوشامد نہیں کی اور نہ ان سے زیادہ خلط ملط پسند پسند کیا۔ البتہ جامعہ اسلامیہ کی ضرورت نے مجھے بے شک در در کی خاک چھنوائی۔ اور ہر ایک کے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور کیا۔

دانستہ میں نے حرام پیسے کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اور ایسی سعید و صالح اولاد دی جو بحمداللہ افعال شنیعہ سے کوسوں دور ہے اور لقمۂ حرام سے محترز اور امور خیر کی طرف متوجہ ہے۔ میں نے حسب استطاعت قومی کاموں میں حصہ لیا لیکن اپنی کسی ذاتی غرض کو اس سے وابستہ نہیں کیا۔ اپنی شکم پُری یا ہوا پرستی کا اسے ذریعہ نہیں بنایا۔

میں اپنے رشتہ داروں سے ہمیشہ محبت کے ساتھ پیش آیا ہوں۔ میں نے اپنے غریب رشتہ داروں کو کبھی ذلیل نہیں کیا۔ میں نے ان سے ملنے میں کبھی اپنی توہین نہیں سمجھی۔ حسب استطاعت ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اپنے بزرگوں کا

ادب ملحوظ رکھا کبھی ان کے سامنے گستاخانہ کلام نہیں کیا۔

میں نے مجلس خوانی کا نذرانہ کبھی کسی سے طے نہیں کیا جو کسی نے دیدیا بے چون و چرا منظور کر لیا۔ سالہا سال جن منبروں پر پڑھتا رہا بانیان مجلس سے کبھی کسی اضافہ کی درخواست نہیں کی۔

کراچی میں سیکڑوں مجلس میں نے بغیر کسی نذرانہ کے پڑھی۔ چند سال سے صرف جامعہ امامیہ کی ضرورتوں کے پیش نظر یہ قید ضرور لگائی کہ جو صاحب مجھ سے مجلس پڑھوائیں وہ پہلے حسب حیثیت جامعہ امامیہ کو کچھ دے کر رسید وہاں سے حاصل کر لیں۔

مقدمہ بازی سے میں بہت خائف رہا ہوں اسی سال کی عمر میں مجبوری صرف تین بار کورٹ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار بحیثیت اسیسر مرادآباد کی کچہری میں۔ دوسری بار اپنے مکان کی ایک ڈگری کے مقدمہ میں بحیثیت مدعی۔ مدعا علیہ سے قرآن اٹھوا کر مقدمہ کو ختم کیا۔ تیسرے جامعہ امامیہ کے مقابل جو اہلسنت نے مسجد بنائی تھی اس کے سلسلے میں ضمانت اور مچلکوں کے لئے۔

یہ چند باتیں میں نے اس لئے لکھی ہیں کہ میری اولاد اور اولاد کی اولاد میرے نقش قدم پر چلے اور ان باتوں کو بطور میری وصیت کے یاد رکھے۔

آج مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ میں اپنے حالات کو ختم کر رہا ہوں نہیں معلوم ابھی مجھے کتنے دن اور زندہ رہنا ہے۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں میری یہ التجا ہے کہ میری زندگی کا جو حصہ باقی ہے اس میں میرے ہوش و حواس کو باقی و برقرار رکھنا۔

تاکہ جو تیرے دین کی خدمت کچھ اور انجام دیتا ہوا یہاں سے رخصت ہوں ۔ یا اللہ یہ تیرا عبد ذلیل مذنب وسیہ کار بندہ تیری رحمت کے سایہ میں اپنی آخری سانس ایک ساز گار فضا کی سپرد کرکے تیری بارگاہ قدس و جلال میں حاضر ہو جائے ۔

میری وصیت

میری آخری تمنا بطور وصیت یہ ہے کہ میری قبر جامعہ امامیہ میں بنے میری اولاد میرے احباب کی مدد سے اس میں کامیابی کے لئے پوری کوشش کرے ۔ چونکہ جامعہ امامیہ کی خدمت میں چودہ پندرہ برس سے لگا ہوا ہوں اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کے انجام دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی میرا تعلق اس مقدس عمارت سے باقی رہے۔ میری غرض اس میں یہ ہے کہ جامعہ امامیہ میں آنے والے مجھے یاد رکھیں اور ایک سورۂ فاتحہ کا ثواب میری روح کو بخشیں یہی میری خدمات کا صلہ میرے لئے ہوگا۔ میرے جذبات کی ترجمانی حزیں کا یہ شعر ہے ؎

حزیں از پائے رہ پیما بسے آوارگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا

میری مصنفات

(۱) تعلیمی خدمات

#	نام کتاب مع صفحات	سنہ طباعت	#	نام کتاب مع صفحات	سنہ طباعت
۱	تحفۃ القواعد صفحہ ۳۲	سنہ ۱۹۱۲ء	۱۷	ترجمان فارسی حصہ اول	سنہ ۱۹۲۹ء
۲	گلدستۂ مضامین صفحہ ۳۲	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸	ترجمان فارسی حصہ دوم	سنہ ۱۹۲۹ء
۳	ادیب فارسی	سنہ ۱۹۲۱ء	۱۹	بچوں کی کہانیاں حصہ اول	سنہ ۱۹۳۰ء
۴	تہذیب القواعد صفحہ ۳۲	سنہ ۱۹۲۲ء	۲۰	بچوں کی کہانیاں حصہ دوم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۵	ذخیرۂ فارسی مع مضامین صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۲۲ء	۲۱	بچوں کی کہانیاں حصہ سوم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۶	معلم خوشخط نویسی	سنہ ۱۹۲۳ء	۲۲	بچوں کی کہانیاں حصہ چہارم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۷	تکمیل اردو صفحہ ۳۰	سنہ ۱۹۲۳ء	۲۳	گلزار فارسی حصہ اول	سنہ ۱۹۳۰ء
۸	تہذیب اللغات	سنہ ۱۹۲۳ء	۲۴	گلزار فارسی حصہ دوم	سنہ ۱۹۳۰ء
۹	چمن اردو	سنہ ۱۹۲۳ء	۲۵	لڑکیوں کی کہانیاں حصہ اول	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۰	گنجینۂ مضامین	سنہ ۱۹۲۵ء	۲۶	لڑکیوں کی کہانیاں حصہ دوم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۱	نصاب فارسی	سنہ ۱۹۲۶ء	۲۷	لڑکیوں کی کہانیاں حصہ سوم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۲	قواعد اردو حصہ اول	سنہ ۱۹۲۶ء	۲۸	لڑکیوں کی کہانیاں حصہ چہارم صفحہ ۹۶	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۳	قواعد اردو حصہ دوم	سنہ ۱۹۲۸ء	۲۹	گلدستۂ قواعد حصہ اول صفحہ ۴۸	سنہ ۱۹۳۱ء
۱۴	بہارستان اردو حصہ اول	سنہ ۱۹۲۹ء	۳۰	گلدستۂ قواعد حصہ دوم صفحہ ۴۸	سنہ ۱۹۳۱ء
۱۵	بہارستان اردو حصہ دوم صفحہ ۱۹۰	سنہ ۱۹۲۹ء	۳۱	سلک اردو حصہ اول صفحہ ۲۵۰	سنہ ۱۹۳۲ء
۱۶	دبستان اردو صفحہ ۱۲۸	سنہ ۱۹۲۹ء	۳۲	سلک اردو حصہ دوم صفحہ ۲۵۰	سنہ ۱۹۳۲ء

۳۳ سلک اردو حصہ سوم صفحہ ۳۸ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۳ تحصیل القواعد صفحہ ۳۴ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۴ سلک اردو حصہ چہارم صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۴ تکمیل القواعد صفحہ ۴۹ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۵ سلک اردو حصہ پنجم صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۵ تشمیم القواعد صفحہ ۹۶ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۶ سلک اردو حصہ ششم صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۶ نسیم القواعد صفحہ ۸۰ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۷ کمال اردو حصہ اول صفحہ ۹۶ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۷ نزہۃ القواعد صفحہ ۴۳ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۸ کمال اردو حصہ دوم صفحہ ۱۱۶ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۸ قسیم القواعد صفحہ ۴۰ سنہ ۱۹۳۳ء

۳۹ کمال اردو حصہ سوم صفحہ ۱۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء | ۴۹ توصیف القواعد صفحہ ۱۹۱ سنہ ۱۹۳۳ء

۴۰ کمال اردو حصہ چہارم صفحہ ۱۵۰ سنہ ۱۹۳۳ء | ۵۰ رسالہ قواعد اردو صفحہ ۱۹ سنہ ۱۹۳۳ء

۴۱ کمال اردو حصہ پنجم صفحہ ۱۶۰ سنہ ۱۹۳۳ء | ۵۱ ادبی خطوط صفحہ ۳۴ سنہ ۱۹۳۳ء

۴۲ تسہیل القواعد صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء | ۵۲ شباب اردو صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء

۵۳ کلید امتحان صفحہ ۱۶ سنہ ۱۹۳۵ء

(۲) ادبی خدمات

۵۴ سیر کواکب صفحہ ۱۰۸ سنہ ۱۹۱۵ء | ۶۱ رہنمائے مسرت صفحہ ۴۳ سنہ ۱۹۲۱ء

۵۵ صحبت کا اثر صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۱۵ء | ۶۲ کارخانۂ عالم صفحہ ۲۵ سنہ ۱۹۲۱ء

۵۶ گل صد برگ صفحہ ۹۶ سنہ ۱۹۱۶ء | ۶۳ تہذیب الاطفال صفحہ ۱۹ سنہ ۱۹۲۲ء

۵۷ اخلاق حسنہ صفحہ ۱۰۹ سنہ ۱۹۱۶ء | ۶۴ اسرار قدرت صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۲۳ء

۵۸ زاد عاصی صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۱۶ء | ۶۵ لطائف الشعرا صفحہ ۳۲ سنہ ۱۹۲۵ء

۵۹ ارمغان عاصی صفحہ ۲۴ سنہ ۱۹۱۸ء | ۶۶ دنیا کے چار دروازے صفحہ ۱۵۶ سنہ ۱۹۲۶ء

۶۰ ایام غدر صفحہ ۲۵ سنہ ۱۹۱۹ء | ۶۷ مرثیہ استاد صفحہ ۱۶ سنہ ۱۹۲۶ء

٦٨ اردو گلستاں صہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۲ء

٦٩ شہید لبنان صہ ۱٦ سنہ ۱۹۳۳ء

۷۰ ثمرۂ تجارت صہ ۲۰ سنہ ۱۹۳۳ء

۷۱ یورپ کے سیاسے صہ ۱۵۲ سنہ ۱۹۳۳ء

۷۲ زندگی کے دو رخ صہ ۱۲۸ سنہ ۱۹۳۳ء

۷۳ مشاہیر عالم صہ ۳۲ سنہ ۱۹۳۳ء

۷۴ انسانیت اور حیوانیت صہ ۳۲۵ سنہ ۱۹۳۳ء

(۳) مذہبی خدمات

۷۵ اصحاب رسول حصہ اول صہ سنہ ۱۹۱٦ء

۷٦ اصحاب رسول حصہ دوم صہ سنہ ۱۹۱٦ء

۷۷ اصحاب رسول حصہ سوم صہ سنہ ۱۹۱۷ء

۷۸ قضایائے امیرالمومنین صہ ۱۲ سنہ ۱۹۱۹ء

۷۹ آئینہ اسلام صہ ۳۰ سنہ ۱۹۱۹ء

۸۰ شیعہ دینیات کورس صہ ۱۱۲ سنہ ۱۹۲۲ء

۸۱ شہید صہ ۲۴ سنہ ۱۹۲۲ء

۸۲ جنت البقیع صہ ۹٦ سنہ ۱۹۲۵ء

۸۳ مناظرۂ تقدیر و تدبیر صہ سنہ ۱۹۲۹ء

۸۴ حقیقت روح صہ ۱۰۴ سنہ ۱۹۲۹ء

۸۵ جواز تعزیہ صہ ۹٦ سنہ ۱۹۳۱ء

۸٦ حقیقی اصحاب رسول صہ ۳۰۳ سنہ ۱۹۳٦ء

۸۷ سوانح عمری حضرت رسولِ خدا صہ ۱۵۰ سنہ ۱۹۳٦ء

۸۸ سوانح عمری حضرت علی صہ ۱۹۰ سنہ ۱۹۳٦ء

۸۹ سوانح عمری حضرت فاطمہ صہ ۵۳ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۰ سوانح عمری حضرت امام حسن صہ ۹٦ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۱ سوانح عمری حضرت امام حسین صہ ۲۰۴ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۲ سوانح عمری حضرت امام چہارم صہ ۱۱۲ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۳ سوانح عمری حضرت امام پنجم صہ ۷۲ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۴ سوانح عمری حضرت امام ششم صہ ۱۳٦ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۵ سوانح عمری حضرت امام ہفتم صہ ۹۸ سنہ ۱۹۳۷ء

۹٦ سوانح عمری حضرت امام ہشتم صہ ۱۲۰ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۷ سوانح عمری حضرت امام نہم صہ ۸۳ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۸ سوانح عمری حضرت امام دہم صہ ٦٦ سنہ ۱۹۳۷ء

۹۹ سوانح عمری حضرت امام یازدہم صہ ۴۲ سنہ ۱۹۳۷ء

۱۰۰ سوانح عمری حضرت امام دوازدہم صہ ۱۰۰ سنہ ۱۹۳۷ء

۱۰۱ دینی کہانیاں حصہ اول صہ ۲۰۳ سنہ ۱۹۳۸ء

۱۰۲ دینی کہانیاں حصہ دوم صہ سنہ ۱۹۳۸ء

۱۰۲ دینی کہانیاں حصہ سوم	سنہ ۱۹۳۰	۱۲۸ مختار نامہ ص ۴۸	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۰۳ دینی کہانیاں حصہ چہارم	سنہ ۱۹۳۰	۱۲۹ سوانح عمری حضرت حجتؑ ص ۴۸	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۰۴ دینی کہانیاں حصہ پنجم ص ۳۲	سنہ ۱۹۳۰ء	۱۳۰ فضائل امیر المومنینؑ ص ۴۸	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۰۵ دینی کہانیاں حصہ ششم ص ۳۰۰	سنہ ۱۹۳۰ء	۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳ دعا کا شکول دعا اور حدیث	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۰۶ تحفۃ الابرار ص ۳۲	سنہ ۱۹۳۹ء	کساء مترجم	
۱۰۸ مذہبی مکالمہ ص ۳۹۴	سنہ ۱۹۳۹ء	۱۳۴ حکومت الٰہیہ اور سیاست علویہ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۰۹ ید اللہی عما پنجہ ص ۹۶	سنہ ۱۹۳۹ء	۱۳۵ حیات بعد الموت ص ۴۸	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۰ سر فروشان ملت ص ۳۰۴	سنہ ۱۹۳۹	۱۳۶ عقاید الشیعہ ص ۸۸	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۱ خواتین اسلام ص ۱۹۰	سنہ ۱۹۳۹	۱۳۷ تحقیق حدیث قرطاس ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۲-۱۱۳ بچوں کی دینیات ہر دو حصہ ص ۳۲-۳۲	سنہ ۱۹۳۰ء	۱۳۸ تحقیق حدیث فدک ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۴-۱۱۵ شیعہ دینیات ہر دو حصہ ۱۱۲-۳۲	سنہ ۱۹۳۰ء	۱۳۹ تحقیق مسئلہ متعہ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۶ مصباح المجالس حصہ اول ص ۳۱۲	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۴۰ تحقیق مسئلہ تقیہ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۷ مصباح المجالس حصہ دوم ص ۱۱۲	سنہ ۱۹۳۱ء	۱۴۱ تحقیق مسئلہ خمس و حق ذوی القربیٰ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۸ تحفۃ المومنین ص ۳۰۰	سنہ ۱۹۳۲ء	۱۴۲ جواز مراسم عزا ص ۴۰	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۱۹-۱۲۳ مجمع الآیات چار جلد تفسیر [illegible]	سنہ ۱۹۳۲ء	۱۴۳ نام نہاد اہل حدیث کا مذہب ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۲۴ ترجمہ قرآن مع حاشیہ	سنہ ۱۹۳۴ء	۱۴۴ یزید بن معاویہ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۲۵ مجالس خواتین ص ۳۰۰	سنہ ۱۹۵۲ء	۱۴۵ تحقیق مسائل فقہ ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۲۶ محافل مجالس ص ۳۴۴	سنہ ۱۹۵۲ء	۱۴۶ تحقیق مسئلہ تحریف ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء
۱۲۷ حقایق اسلام ص ۱۱۲	سنہ ۱۹۵۲ء	۱۴۷ تحقیق مسئلہ عقد کلثوم ص ۳۲	سنہ ۱۹۵۳ء

۱۴۸۔ تحقیق ایمان ابو طالب ص ۳۲	۱۹۵۳ء	۱۶۱۔ واقعہ کربلا کے بعد ص ۳۲	۱۹۵۹
۱۴۹۔ تحقیق مسئلہ خلافت ص ۳۲	۱۹۵۳ء	۱۶۲۔ رباعیات انیس ص ۹۶	۱۹۵۳ء
۱۵۰۔ تحقیق مسئلہ بیعت یزید ص ۳۲	۱۹۵۳ء	۱۶۳۔ رباعیات دبیر ص ۹۶	۱۹۵۳
۱۵۱۔ تحقیق تفضیل اہل بیت ص ۳۲	۱۹۵۳ء	۱۶۴۔ تحقیق مسئلہ بدا ص ۳۲	۱۹۵۳ء
۱۵۲۔ اہلبیت و منازل روحانیت ص ۳۲	۱۹۵۵ء	۱۶۵۔ خصائل حسنہ ص ۲۰۰	۱۹۶۳ء
۱۵۳۔ سکینہ بنت الحسین ص ۳۲	۱۹۵۵ء	۱۶۶۔ امامت منصوصہ ص ۴۰	۱۹۶۳ء
۱۵۴۔ واقعات کربلا کی مختصر تاریخ ص ۴۸	۱۹۵۶ء	۱۶۷۔ نورانی پیکر ص ۴۰	۱۹۶۳ء
۱۵۵۔ واقعات کربلا پر تحقیقی نظر ص ۴۸	۱۹۵۵ء	۱۶۸۔ مودت ذوی القربیٰ ص ۴۰	۱۹۶۳ء
۱۵۶۔ واقعہ کربلا کی مختصر تاریخ ص ۴۸	۱۹۵۶ء	۱۶۹۔ جواز مراسم ص ۴۰	۱۹۶۳ء
۱۵۷۔ اہلبیت کا احسان اسلام پر ص ۴	۱۹۵۳ء	۱۷۰۔ مجمع الفضائل ترجمہ مناقب شہر آشوب ص ۹۲	۱۹۶۳ء
۱۵۸۔ اہلبیت اور اسلام ص ۴	۱۹۵۳ء	۱۷۱۔ الشافی ترجمہ اصول کافی جلد اول	
۱۵۹۔ اخلاق الائمہ ص ۹۶	۱۹۵۶ء	۱۷۲۔ اہلبیت اور اسلامی خدمات	۱۹۶۳ء
۱۶۰۔ اہلبیت کی دینی خدمات ص ۴۸	۱۹۵۶ء	۱۷۳۔ مصباح المجالس حصہ چہارم	۱۹۶۳ء
۱۷۴۔ الشافی ترجمہ اصول کافی جلد دوم	۱۹۶۶	۱۷۵۔ الشافی ترجمہ فروع کافی جلد اول	۱۹۶۶
۱۷۶۔ الشافی ترجمہ فروع کافی جلد ۲	۱۹۶۹	۱۷۷۔ مصباح المجالس حصہ ۵	۱۹۶۰
۱۷۸۔ مصباح المجالس حصہ چہارم	۱۹۶۳	۱۷۹۔ مجمع الآیات جلد اول	
۱۸۰۔ مجمع الآیات جلد ۲		۱۸۱۔ میری سرگزشت	۱۹۷۰
۱۸۲۔ سیرت علی		۱۸۳۔ سیرت الرسول	
۱۸۴۔ امامت منصوصہ			

باقی دارد

شمیم بک ڈپو کی شہرۂ آفاق کتابیں

7:32	7:22	3:09	[illegible]	[illegible]	[illegible]
7:32	7:22	3:10	3:20	پیر	[illegible]
7:32	7:22	3:11	3:21	منگل	[illegible]
7:32	7:22	3:12	3:22	بدھ	[illegible]
7:32	7:22	3:13	[illegible]	جمعرات	[illegible]
7:31	7:21	3:13	3:23	جمعۃ المبارک	[illegible]
7:32	7:21	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]